زمین اور
فلک اور
انتظار حسین

# زمین اور فلک اور

انتظار حسین

مور کی تلاش میں

بندر کی دُم

زمین اَور فلک اَور

معذرت کا ڈیڑھ حرف

# مور کی تلاش میں

میں نے اپنے قدموں کی چاپ سنی اور حیران ہوا۔ یہ میں کس زمین پہ چل رہا ہوں۔ پھر میں نے ایک ایک قدم جما کر زمین پہ رکھا اور ہر قدم کی چاپ کو کان لگا کر سنا۔ پھر میں نے اس فصیل کو چھو کر دیکھا جو راستہ کے متصل دور تک چلی گئی تھی۔ پھر میں اس املی کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ جو فصیل سے تھوڑے فاصلہ پر کھڑی تھی اور ایک پتی توڑ کر زبان پہ رکھی۔ میں نے زبان پہ ایک نیا ذائقہ محسوس کیا اور تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ایک نئی طرح کی ٹھنڈک میرے بدن میں اُترتی چلی گئی۔ تو کیا سچ مچ میں دلی میں آگیا ہوں۔ اصل میں یہ سب کچھ اچانک ہوا تھا۔ ریل گاڑی رات بھر اندھیرے میں چلتی رہی اور جانے کن کن سٹیشنوں سے گذرتی رہی۔ سویرا ہوا تو میں نے دیکھا کہ گاڑی ایک بھاری پل پہ کھڑی ہے اور پل سے پرے دریا کے اس پار شہر اپنے بلند و بالا میناروں، گنبدوں اور برجیوں کے ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ میں نے اِن میناروں گنبدوں اور برجیوں کو تھوڑا تھوڑا پہچانا اور حیران ہو کر سوچا کہ کیا یہ پل جمنا کا ہے اور کیا میں دلی کے دروازے پہ کھڑا ہوں۔ گاڑی بار بار شہر کو پکار رہی تھی۔ مگر ادھر سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ بس میرا دل

بیٹھنے لگا۔ شاید میں عجلت میں نکل کھڑا ہوا ہوں۔ شاید اس سفر کے لئے مجھے
ابھی اور انتظار کھینچنا چاہیئے تھا۔ مگر پھر گاڑی حرکت میں آئی۔ وہ آہستہ آہستہ چل
رہی تھی اور میں کسی قدر مذبذب کسی قدر بجھا بجھا شہر میں داخل ہو رہا تھا۔

نہانے دھونے کے بعد طبیعت بحال ہوئی۔ میں اور منو بھائی اپنے کمرے
سے نکل برابر کے کمرے میں جو آفس روم تھا آئے اور وہاں میز پہ رکھے ہوئے ٹیلیفون
کو دیکھ کر اس شخص سے جو میز پہ جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ جھجکتے ہوئے پوچھا "یہاں
سے ہم فون کر سکتے ہیں"

"کر لیجئے"

میں نے جیب سے تیزی سے اپنی ڈائری نکالی۔ دلی کا ایک ہی فون نمبر
میرے پاس تھا، ربوتی سرن شرما کا۔ ڈائل گھمانے لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنے کچھ
خواب یاد آگئے۔ کہیں پھر وہی واردات تو نہیں گزرے گی کہ اچانک آنکھ کھل جائے
گی۔ میں نے فون رکھ دیا۔ "آؤ یہاں سے نکلتے ہیں" اور ہم دونوں آفس روم سے
باہر آئے، پھر گیٹ سے نکل سڑک پہ آگئے۔ اب میں قدم ناپ تول کر رکھ رہا تھا کہ
قدموں تلے کی زمین کو پوری طرح محسوس کر سکوں اور رستہ سے متصل فصیل کے
برابر برابر چلتے ہوئے بار بار اسے چھو کر دیکھ رہا تھا۔ یہ مقبرہ ہمایوں کی فصیل ہے
اور یہ جھونکا جو املی کی پتیوں میں ہلچل مچا کر ابھی مجھے چھوتا ہوا گزرا ہے دلی کی ہوا
کا جھونکا ہے۔ واقعی؟ تو یہ دلی کی زمین ہے جس پہ میں چل رہا ہوں۔ میں حیران رہ گیا۔

"کہاں چلنا ہے" منو بھائی نے سوال کیا۔

میں ٹھٹھکا۔ اب ہم چلتے چلتے چوراہے پر آگئے تھے۔ سوچا "چلو جامعہ ملیہ
چلتے ہیں"

میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ دلی میں ہونے کی پہلی گواہی میں جامعہ ملیہ



سے حاصل کروں گا۔ اب ہم سڑک کے نکڑ پہ کھڑے ٹیکسی والے سے جامعہ چلنے
کی بات کر رہے تھے۔

جامعہ کے دفتر میں داخل ہو کر میں نے پوچھا "کیوں جناب گوپی چند نارنگ
صاحب یہاں کہاں ملیں گے"

"نارنگ صاحب، وہ تو ابھی آئے نہیں ہیں"

"کتنی دیر میں آئیں گے"

"اصل میں وہ بمبئی گئے ہوئے تھے۔ آج انہیں آ تو جانا چاہیے۔ مگر پتہ نہیں
کس وقت آئیں گے"

"اچھا قیصر صاحب کہاں ملیں گے؟"

"قیصر صاحب۔ وہ کون صاحب ہیں"

"ابوالکاظم قیصر زیدی، جامعہ کے وائس پرنسپل"

"وہ تو ریٹائر ہو گئے"

اب میں تھوڑا پریشان ہوا "اچھا دیکھئے۔ نارنگ صاحب کے گھر پر تو
فون ہے نا۔ وہ ذرا ملا کر دیکھئے کہ وہ بمبئی سے آگئے ہیں یا نہیں۔ آگئے ہیں تو
میرا نام انہیں بتا دیجئے۔ انتظار حسین"

"انتظار حسین" نوجوان نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا "آپ کہاں سے آئے
ہیں"

"پاکستان سے"

اس نوجوان نے مجھے پھر سے پیر تک دیکھا "انتظار حسین جو افسانہ نگار ہیں"

"جی"

"مگر آپ تو جشنِ انیس پر آ رہے تھے"

"جی ہاں، اسی وقت کا چلا ہوا ہیں آج پہنچا ہوں" اور میں نے دل میں کہا کہ عزیز میں تو اس سے پہلے کا چلا ہوا ہوں۔

اس تعارف کے بعد اس نوجوان نے بہت گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ جلدی جلدی ڈائل گھمانا شروع کیا۔ مگر نمبر تھا کہ ملنے میں نہیں آرہا تھا۔ آخر کو مل گیا۔ نارنگ صاحب سے بات ہوئی "ابھی آرہا ہوں۔ جب تک آؤں تب تک شمیم حنفی سے ملئے"۔

نوجوان دوڑ کر باہر نکل گیا۔ پھر میں نے باہر نکل کر منو بھائی کو پکارا کہ غالب کو دیکھ چکے۔ اب اندر آجاؤ۔ اصل میں منو بھائی نے پورے سفر میں بہت خبرگیری کی تھی۔ مگر دلی پہنچ کر ٹھکانا بنا لینے کے بعد اس نے گویا طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے فرائض انجام دے چکا ہے، اب میرے فرائض شروع ہوتے ہیں۔ بس دوستوں کو ڈھونڈ نکالنے کی اس ساری سرگرمی سے بے تعلق وہ باہر ٹہل رہا تھا اور غالب کے اس مجسمہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جو جامعہ کے وسط میں نصب تھا۔

ہم دونوں کمرے میں آکر بیٹھے تھے کہ ایک صاحب گھبرائے ہوئے داخل ہوئے، دُبلے پتلے، گندمی رنگت۔ انہوں نے پہلے منو بھائی کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا۔ پھر منو بھائی کو دیکھا اور پھر مجھے دیکھا "آپ میں سے انتظار صاحب کون ہیں"

"جی میں ہوں"

"میں شمیم حنفی ہوں"

میں فوراً اُٹھ کر اُن سے بغل گیر ہوا۔ بیٹھ کر انہوں نے ایک مرتبہ پھر میرا پورا جائزہ لیا "صاحب میں کلاس لے رہا تھا کہ مجھے آپ کے آنے کی اطلاع پہنچی۔ میں بوکھلا گیا۔ میری کلاس ٹھٹھا مار کر ہنس پڑی۔ تو میں بہت بوکھلایا ہوا ہوں"



"آخر کیوں"

"صاحب یقین نہیں آرہا" انہوں نے مجھے پھر سر سے پیر تک دیکھا "آپ آ کیسے گئے"

میرے عزیز یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا۔ میں دلی میں ہونے کا یقین حاصل کرنے ہی کے لئے تو جامعہ میں آیا ہوں "اچھا اب آپ کچھ دوستوں کو فون کریں، بلراج مینرا کو، زبیر رضوی کو، محمود ہاشمی کو اپنے بھائی عمیق حنفی کو اور....." یہ کہتے کہتے میں نے ایک مرتبہ پھر ڈائری کھول کر ریوتی کا فون نمبر دیکھا، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا "اچھا فی الحال انہیں سے کسی طور رابطہ قائم کیجئے"

"معاف کیجئے عمیق حنفی میرے بھائی نہیں ہیں"—— "واقعی؟ خیر کوئی بات نہیں"

رابطہ لشٹم پشٹم قائم ہوا۔ ایک آیا، پھر دوسرا آیا، پھر تیسرا آیا اور اب نارنگ صاحب کا کمرہ یاروں سے بھرا ہوا ہے۔ ان یاروں سے جنہیں میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ یاروں کے جمگھٹے میں میں بے اعتباری کے مرحلے سے نکل کر اعتبار کی منزل میں داخل ہوتا ہوں۔ میں دلی میں ہوں" اپنے آپ سے چپکے سے کہتا ہوں۔ تو اب مجھے، میں طے کرتا ہوں، فون کر کے ریوتی کو بتا دینا چاہیئے کہ میں آگیا ہوں۔

میں دلی میں ہوں اور بستی نظام الدین میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔ اس مور کی تلاش میں جس نے مجھے اس سمے کہ دونوں وقت مل رہے تھے..... پکارا تھا۔ اور میں نہیں رکا تھا۔ وہ بھی کیا وقت تھا۔ دلی میں اور دلی سے قریب و دور پورے ہندوستان میں کیا کچھ ہو چکا تھا۔ پاکستان جانے کے بعد یہ میرا پہلا سفر دلی تھا۔ اس شہر میں جو کچھ ہو چکا تھا۔ اُسے میں یہاں چلتے پھرتے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ سو مجھے سلطان المشائخ اور امیر خسرو کے مزار بہت اجاڑ نظر آئے اور غالب

کا مزار تو تھا ہی ویرانے میں۔ وہ بھادوں کی شام تھی۔ اب دونوں وقت مل رہے تھے اور ہم تین جنے میں، ریوتی اور تیسرا دوست سنگھ، حضرت محبوب الٰہی کی اُداس بھری درگاہ سے نکل کر اور غالبؔ کی ویران قبر سے گذر کر جھاڑیوں کے بیچ رستہ ٹٹولتے خاموش چل رہے تھے۔ تب کسی جھاڑی کے پیچھے سے ایک مور نے مجھے پکارا۔ واضح ہو کہ اپنے چھوڑے ہوئے دیار میں ساون بھادوں کی شامیں بہت اُداس ہوتی ہیں۔ دکھیا کوئل دن بھر پکار پکار کے تھک چکی ہوتی ہے۔ پرندے ایک ایک کر کے سب چپ ہو جاتے ہیں۔ اب صرف مور ایک ہراس کے عالم میں پکارتے رہ جاتے ہیں۔ مگر وہ مور اکیلا تھا کہ رک رک کر اُداس آواز میں پکار رہا تھا۔ وہ مور تھا یا شاید دلی شہر کی آتما کہ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ کے آس پاس جھاڑیوں میں بھٹک رہی تھی اور اپنے کھوتے ہوؤں کو پکار رہی تھی۔ اس پکار نے دور تک میرا تعاقب کیا۔ مگر شام گہری ہوتی جا رہی تھی اور ہمیں ابھی بہت چلنا تھا۔ ٹھہرنے اور سننے کا وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔ مگر اب میں ٹھہرنا اور سننا چاہتا ہوں۔ میں بستی نظام الدین میں دیکھتا پھرتا ہوں کہ وہ جھاڑیاں کہاں ہیں۔ جن کے بیچ سے مور نے مجھے پکارا تھا۔ وہ جھاڑیاں مجھے یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ جہاں اگے جھاڑیاں اور گھنے پیڑ تھے۔ وہاں اب اونچی عمارتیں کھڑی ہیں۔ جہاں کچے پکے رستے تھے۔ وہاں اب پختہ سڑکیں ہیں۔ غالب کی قبر کے آس پاس اب کوئی ویرانہ نہیں ہے۔ غالبؔ کی قبر کے ارد گرد جنگلا کھینچ گیا اور سنگِ مرمر کا فرش بن گیا۔ بہت اچھا ہوا۔ غالب اکیڈمی تعمیر ہو گئی اور بھی اچھا ہوا۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی جھاڑیاں اور پیڑ اور کچے رستے کہاں گئے اور مور کہاں اُڑ گیا۔ اس شہر کو خوب طرح برتنے کا شرف تو مجھے حاصل نہیں ہوا تھا۔ مگر اتنا بہر حال یاد ہے کہ شہر سے درگاہ آتے ہوئے



سنسان ویران رستے بہت آتے تھے۔ اب شہر سے درگاہ تک کے سفر میں کوئی سنسان رستہ نہیں آتا۔ ایک شاد آباد شاہراہ ہے۔ جو شہر کو بستی نظام الدین سے ملاتی ہے۔ اسی شاہراہ پر درگاہ سے قریب ہی انٹر کانٹی ننٹل کی عمارت ہے۔ درگاہ محبوبِ الٰہی اور اس کی ہمسائیگی میں انٹر کانٹی ننٹل ہوٹل، امیر خسروؒ کی ایک اور اَمل۔ بستی نظام الدینؒ اپنے مور کو قربان کر کے آباد ہوئی ہے۔

یہ اکیلی بستی نظام الدین ہی کی داستان نہیں۔ پوری دلی کا احوال یہی ہے۔ شاد آباد ہونے کے شوق میں اس نے اپنے ویرانوں کو گم کر دیا ہے اور اپنے موروں کو رخصت کر دیا ہے۔ نئی دلی واہ واہ سبحان اللہ، وسیع شاہرائیں پُر رونق بازار۔ میں نے کناٹ پیلس کو دیکھا اور الف لیلہ کا ابوالحسن بن گیا۔ تقسیم سے پہلے والا کناٹ پیلس اب پھیل پھول کر کتنا وسیع اور کتنا شاد آباد ہو گیا ہے۔ میں نے سامنے نظر کی اور ایک فلک بوس عمارت نظر آئی کہ سچ مچ اسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ دوستوں نے بتایا کہ اپنے زمانے میں پنڈت نہرو نے یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ اس نواح میں کوئی فلک بوس عمارت کھڑی نہ کی جائے۔ مگر ان کے گذرنے کے بعد یہ پابندی باقی نہیں رہی اور اب یہاں فلک بوس عمارتیں کھڑی ہونی شروع ہو گئی ہیں اور جب میں اس نئے نگر میں گھومتے پھرتے ایک پر رونق بازار سے گذر جاتا تو مَیں اُنے ایک پرانی عمارت کی سمت اشارہ کیا "انتظار صاحب، یہ پانڈوؤں کا قلعہ ہے"۔

"پانڈوؤں کا قلعہ؟" میں حیران رہ گیا۔ میں نے لاہور سے چلتے ہوئے یاروں سے کہا تھا کہ جہان آباد تو میں نے دیکھ رکھا ہے۔ اس بار میں اندرپرستھ کی یاترا کروں گا اور میں نے اپنے ذہن میں کچھ یوں نقشہ بنایا تھا کہ دلی شہر سے نکل کر دور پرے کوئی ویرانہ نظر آئے گا۔ جہاں شاید کوئی ٹوٹی ہوئی فصیل رہ گئی

ہو یا شاید محض کچھ پرانی اینٹیں نظر آئیں۔ وہاں چل پھر کر میں اس نگر کو دھیان
میں لاؤں گا۔ جس کی فصیلیں بادلوں کے گالوں کی سماں نرم تھیں اور چندرماں کی
سماں اُجلی تھیں اور جس کے راج محل کا فرش شیتل جل کے سماں چمکتا تھا کہ دریودھن
اس میں داخل ہوتے ہوتے ٹھٹھکا کہ آگے پانی ہے اور دروپدی اس کی سادگی دیکھ کھلکھلا
کے ہنسی۔ مگر میرے ذہن میں بنا ہوا نقشہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ دلی اپنے اس عظیم
ویرانے کو گم کر چکی ہے۔ میں بھرے بازار سے گذر رہا تھا اور منیرا مجھے بتا رہا تھا کہ
وہ سامنے پانڈوؤں کا قلعہ ہے۔

"پانڈوؤں کا قلعہ۔ یار میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں"

"انتظار صاحب۔ اب کیا کریں گے دیکھ کر۔ وہاں کچھ نہیں ہے"

"میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہاں کیا کچھ تھا اور اب کچھ نہیں ہے"

"انتظار صاحب، وہاں کچھ نہیں۔ محض فراڈ ہے"

فراڈ فراڈ کیا، میں نے سوچا، انقلابی منیرا پانڈوؤں کے قلعہ کو فراڈ بتا رہا
ہے یا مہابھارت کی پوری داستان کو فراڈ کہہ رہا ہے اور ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر اس
نوخیز ہندی شاعر نے جس کا نام موہن تھا اور جو سندھ کا شرنارتھی تھا۔ مجھے سمجھانا
شروع کیا کہ کرشن بہت فراڈ آدمی تھا۔ اس نے بھائیوں کو آپس میں لڑایا اور تباہ
کرادیا۔ میں موہن کو سن رہا تھا اور اپنے ٹی ہاؤس کو یاد کر رہا تھا۔ جہاں میں بھیگی مسوں
والے دانشوروں سے کچھ اسی رنگ کے محاکمے حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کے بارے
میں سنتا رہا ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان کے نوخیز ادیب اور بھیگی مسوں والے
دانشور آپس میں کتنی مشابہت رکھتے ہیں کہ جیسے ایک ہی مشین سے نکلے ہوئے
جوڑے ہوں۔

موہن جب اپنی کہہ چکا تو پھر میں نے ایک اعلان کیا "ہندوستان میں



فی الحال کوئی بڑا شاعر کوئی بڑا لیکھک پیدا نہیں ہو سکتا"

"کیوں نہیں ہو سکتا" موہن نے مجھے گھور کے دیکھا۔

"بات یہ ہے کہ ہندوستان کی روح اس کی دیومالا میں ہے اور ادیب اپنی
روح کو پہچانے بغیر بڑا ادیب نہیں بن سکتا"

موہن نے مجھ سے بحث شروع کر دی۔ مگر منیرا چپ بیٹھا تھا۔ مجھے خوب
پتہ تھا کہ میں کیسی ہی رجعت پسندانہ بات کروں منیرا مجھے نہیں ٹوکے گا۔ اس نے
مجھے مہمان جان کر میری رجعت پسندی سے عارضی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ خیر میں نے تو موہن
کی باتوں پہ جل کر یہ قطعی محاکمہ کر دیا تھا۔ ورنہ اتنا مجھے احساس ہے کہ ادب میں اس طرح
حکم لگانا کوئی دانائی کی بات نہیں ہے۔ ویسے میں اب سوچتا ہوں۔ تو مجھے یہ بات ایسی
زیادہ غلط بھی نظر نہیں آتی۔ پرانی کہانیوں کے دیو کی جان طوطے میں ہوا کرتی تھی اور
طوطے تک پہنچنا کتنا مشکل ہوتا تھا۔ جوکھم بانہ شہزادوں کو جان جوکھوں میں ڈال کے
سات سمندر پار کر کے وہاں پہنچنا ہوتا تھا۔ قوموں کی جان بھی طوطے میں ہوتی ہے۔
ہر قوم کا اپنا ایک طوطا ہوتا ہے۔ ہندو قوم کا طوطا اس کی دیومالا ہے۔ مسلمانوں کے
پاس کوئی دیومالا نہیں، صرف تاریخ ہے۔ بس یہ تاریخ ہی ان کا طوطا ہے۔ مگر
پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی ادیب مجھے اپنے طوطے سے بھاگا ہوا نظر آیا
طوطے تک پہنچنا ہے بھی تو جان لیوا کام۔

ہم گھومتے پھرتے پھر ٹی ہاؤس میں آگئے۔ اب شام کا وقت تھا اور ٹی ہاؤس
میں شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کناٹ پیلس کے بیچ میں واقع
یہ ٹی ہاؤس کناٹ پیلس کا حصہ نہیں لگتا۔ اس کا تو سارا نقشہ لاہور کے ٹی ہاؤس
کا سا ہے۔ اسی قسم کی سروس، ویسا ہی شور، ویسی ہی ادیبوں کی باتیں۔ ایک بزرگ
داخل ہوتے ہیں، ڈاڑھی رابندر ناتھ ٹیگور والی۔ میں کھل اٹھا۔ ارے یہ تو دیوندر

سیتھارتھی ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے اب سے پندرہ برس پہلے لاہور میں دیکھے گئے تھے" ستیارتھی جی، آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"بس بھائی کاغذ کالے کرتا رہتا ہوں"

ایک نحیف و نزار چھڑی جیسا بوڑھا چھڑی ٹیکتا داخل ہوتا ہے" منو بھائی، انتظار صاحب، انہیں آپ پہچانتے ہیں۔ یہ ہنس راج رہبر ہیں"

"رہبر صاحب، آپ کے مزاج کیسے ہیں"

"بھائی اچھا ہوں۔ ابھی جیل سے آرہا ہوں"

میں نے سر سے پیر تک رہبر صاحب کو دیکھا" رہبر صاحب آپ ابھی تک جیل جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو انقلابی عمر آنے سے پہلے ہی کوٹھی اور کار کے بندوبست میں مصروف ہو جاتے ہیں"

رہبر صاحب نے میری بات سنی ان سنی سی کر دی ... وہ اپنی سنانا چاہتے ہیں" بھائی میں تمہیں اپنی کتابیں دوں گا۔ پاکستان لے جانا۔ ایک کتاب میں نے لکھی ہے" GANDHI EXPOSED" دوسری کتاب لکھی ہے۔ NEHRUE EXPOSED'

ایک تن جلے نے ٹکڑا لگایا" رہبر جی میں نے بھی ایک پستک لکھی ہے۔

"REHBAR EXPOSED"

رہبر صاحب پر اس کا کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔ انہیں اپنی بات کہنے سے مطلب ہے۔ دوسرے کچھ بھی کہا کریں۔ میں نے رہبر صاحب سے مودبانہ گذارش کی۔

"رہبر صاحب، مجھ پہ دیا کیجئے۔ آپ کی کتابوں کے چکر میں میری دوسری کتابیں بھی کسٹم پر نہ دھری جائیں۔

"ہندی کے ادیب تمہارا انتظار کر رہے ہیں" منیرا نے آکر نوٹس دیا۔



میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو دو لمبی قطاروں میں ہندی کے لیکھک بیٹھے نظر آئے۔ لگتا تھا کہ منیرا نے شہر میں محلہ محلہ جا کر ہندی کے لیکھکوں کو بلاوا دیا ہے۔ ہندی کے لیکھک بہت باغیانہ موڈ میں نظر آتے تھے۔ میں سنتا رہا، سنتا رہا۔ پھر میں نے معذرت کی کہ "نئے ہندی ادب سے میری زیادہ شناسائی نہیں ہے۔

"آپ کی نہ ہو، ہماری تو آپ کے ساہتیہ سے جانکاری ہے"

جواب میں مجھے بھی اپنی جانکاری کا جھوٹا سچا ثبوت تو دینا تھا۔ میں نے گذارش کی کہ" صاحب بات یہ ہے کہ ہندی شاعر کے کچھ پرانے نام اور پرانے بول اپنے کان میں ضرور پڑے ہیں۔ آپ کی نئی شاعری میں ان کا عمل دخل کس حد تک ہے"

"کوئی نام لیجئے"

"مثلاً کبیر جی"

"کبیر" ایک شاعر نے تحقیر سے کہا" اسے تو ہم REJECT کر چکے"

"جب تک آپ کے یہاں دوہے کی فارم موجود ہے آپ کبیر سے کیسے پیچھا چھڑا سکتے ہیں"

"دوہا۔ ہم نے تو دوہے کی فارم ہی کو REJECT کر دیا ہے"

میں اس شاعر کا منہ تکنے لگا۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ "اردو شاعری میں بھی THIRTIES کے زمانے میں نئے شاعروں نے غزل کو اور غزل کے ساتھ میر و غالب کو اسی طرح رد کیا تھا" میں آگے کہنے لگا تھا "پھر وہ خود ہی رد ہو گئے" مگر ہندی کے لیکھک اتنی محبت سے مل رہے تھے کہ مجھے یہ فقرہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ان لیکھکوں کی باتوں سے پتہ چلا کہ انہوں نے سب ہی کو رد کر دیا ہے۔ کبیر

کو ، میراآبائی کو، دوبے کو، بھجن کو۔ اپنے طوطے سے بھاگے ہوئے لیکھک۔ یہ
سب نوجوان ادیب تھے۔ مگر ان کے بیچ ایک بزرگ ہستی بھی تھی۔ دوہرا بدن
گوری رنگت، متین مسکراتی صورت۔ بر میں سفید کھدر کا کرتا، کرتے پر جواہر
کٹ جاکٹ، سر پہ گاندھی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی۔ "انتظار صاحب، منو بھائی
ان سے ملئے۔ یہ وشنو پربھاکر ہندی کے بڑے لیکھک۔ کرشن چندر جی سے ان
کی بہت دوستی تھی۔ انہیں کے ہم عصر ہیں"۔ دوسرے بول رہے تھے تھے۔
وشنو پربھاکر چپ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کسی نوجوان ادیب کے کسی بیان پر
آنکھ بھوں نہیں چڑھائی۔ میں نے گذارش کی کہ اچھا صاحب کچھ اپنی کویتائیں
سنائیے۔ پتہ تو چلے کہ کبیر کو رد کر کے نئی ہندی شاعری نے کیا بنایا ہے۔

لوگ شاید اشارے کے منتظر ہی تھے۔ کوئی بولا کہ پھر یہاں سے اُٹھتے ہیں۔
پورا غول کا غول ٹی ہاؤس سے نکلا اور قریب کے ایک وسیع سبزہ زار میں جا
کر پسر گیا۔ انقلابی شاعروں نے کچھ اتنی گھن گرج سے اپنی نظمیں پڑھیں کہ پارک
میں جہاں تہاں ٹہلتے ہوئے لوگ سمٹ آئے اور اچھا خاصا کوی سمیلن ہو گیا۔
بس کبھی کبھی دور سے آتی ہوئی لتا کی آواز بیچ میں کھنڈت ڈال دیتی تھی۔ مگر
لتا سے تو پاکستان میں بھی مفر نہیں ہے اور وہ تو اس دیوی کا دیس تھا۔ ایک کوتا'
دوسری کوتا، تیسری کوتا، میں سن رہا تھا اور کڑھ رہا تھا کہ کوی لوگ اُردو کی
نظمیں لکھ کر لائے ہیں اور اسے ہندی بتا رہے ہیں۔ یہی احساس مجھے اس وقت
ہوا۔ جب وشنو پربھاکر جی نے سرت بابو کی سوانح جو انہوں نے "ادارہ مسیحا"
کے نام سے لکھی ہے مجھے عطا کی۔ میں اسے جہاں تہاں سے پڑھ رہا تھا اور سوچ
رہا تھا کہ اس کتاب میں رسم الخط کے سوا کونسی بات ہندی والی ہے۔ تو کیا اُردو
اپنے رسم الخط میں ہے۔ "نارنگ صاحب"، میں نے باتوں باتوں میں گوپی چند نارنگ



سے پوچھا "کیا آپ لوگ واقعی اُردو کا رسم الخط بدلنا چاہتے ہیں"

"ہم نہیں۔ ترقی پسند ادیب۔ یہ علی سردار جعفری اور عصمت چغتائی وغیرہ
کا چکر تھا۔ جنہوں نے ہندی کے ادیبوں کے اشارے پر یہ تحریک شروع کی تھی۔
میں نے تو اس کے خلاف مضمون لکھے ہیں۔ بہر حال ان کی بات چلی نہیں"

بات میری سمجھ میں فوراً آگئی۔ ایسی تحریک ترقی پسند ادیب ہی شروع کر
سکتے تھے۔ اپنے طوطے سے بھاگی ہوئی مخلوق اور مجھے پھر وہ مور یاد آجاتا ہے
جس نے بھادوں کی اداس خاموش شام میں مجھے پکارا تھا۔ میں کناٹ پیلس میں
گھومتے ہوئے اس مور کو یاد کرتا ہوں اور ریوتی سے کہتا ہوں کہ یار میں ابھی تک
دلی سے دور ہوں۔ یہ تو میں نئی دلی میں چکر کاٹ رہا ہوں۔ ریوتی بیزاری سے
جواب دیتا ہے "یہ ادیب تو تجھے دلی نہیں دیکھنے دیں گے"

"پھر کیا کیا جائے"

"یہی کہ کل کسی سے وقت طے مت کرنا۔ میں اور سنگھ صبح کو آئیں گے۔
پہلے جامع مسجد چلیں گے۔ پھر چاندنی چوک۔ کچھ خریداری کر لینا۔ کیوں منو بھائی"

"بالکل ٹھیک ہے"

اصل میں ریوتی نے پہلی ہی شام مجھے ادیبوں کے بیچ سے اڑا لیجانے کی کوشش
کی تھی۔ نارنگ صاحب کے گھر میں مجلس جمی ہوئی تھی۔ کمرہ یاروں سے بھرا ہوا تھا
کہ اتنے میں ریوتی اور سنگھ داخل ہوئے، مجمع کا جائزہ لیا۔ پھر دونوں نے ہم دونوں
کو منہ میں دبایا اور یہ جا وہ جا۔

یہ ریوتی کا نیا بنایا ہوا گھر ہے۔ میں ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر اس کے
در و دیوار کا جائزہ لیتا ہوں، ان سے انہام و تفہیم کی کوشش کرتا ہوں۔ ریوتی
کہتا ہے کہ اس کمرے کی جو ترتیب سرلا نے قائم کی تھی وہ جوں کی توں ہے۔

میں نے اس میں کوئی ردّو بدل نہیں کی ہے۔ سرلا۔ میں سرلا کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر جھجک جاتا ہوں۔ خیر اب مجھے کیسا اشارہ مل گیا ہے۔ میں کچھ کہنے لگتا ہوں کہ گڑبڑا جاتا ہوں۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ تو اس کمرے کی سیٹنگ وہی ہے۔ جو سرلا نے کی تھی۔ مگر میں اس گھر کے سیاق و سباق میں سرلا کو اپنے دھیان میں نہیں لاسکتا۔ میرا دھیان پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے اور لودھی کالونی کے اس فلیٹ میں بھٹکنے لگتا ہے۔ جہاں میں نے اپنے پہلے سفر ہندوستان کے موقعہ پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس گھر میں کوئی ڈرائینگ روم نہیں تھا۔ نہ کسی کمرے میں کسی خاص ترتیب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بس سرلا کے وجود نے اس گھر میں ایک ترتیب قائم کردی تھی۔ اس سمے اس گھر سے باہر میری کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ وہ میری ادبی زندگی کے ابتدائی برس تھے اور پھر یہ بات بھی تھی کہ قیامِ پاکستان سے پیدا ہونے والی بحثوں میں ترقی پسندوں کے خلاف خاصا کچھ لکھ چکا تھا۔ سو دلی کے اس وقت کے ادبی حلقوں کے لئے کہ ترقی پسند حلقے تھے۔ میرے کوئی معنی نہیں تھے اور مجھے بھی ان سے میل ملاقات میں کوئی معنی نظر نہیں آتے تھے۔ سو ریوتی جتنی دیر دفتر میں رہتا اتنی دیر میں لارنس کا مجموعۂ مضامین کہ اس گھر میں میرے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ پڑھتا رہتا اور پس منظر میں تھالوں اور پرانتوں کی موسیقی جاری رہتی۔ رسوئی سے مستقل ایک ہلکا میٹھا شور سنائی دیتا رہتا۔ کبھی تھالوں اور پرانتوں کے منجھنے دُھلنے کا شور، کبھی کٹوریوں کے کھنکنے کا شور اور میں حیران ہوتا کہ سرلا نے شادی ہوتے ہی اس گھر میں کتنی تھالیں پرانتیں اور کٹوریاں اکٹھی کرلی ہیں۔ پھر دُھلے ہوئے فرش پر سیتل پاٹی بچھتی۔ بیچ میں ایک تھالی رکھی جاتی۔ جس میں چھوٹی چھوٹی پیتل کی کٹوریاں چنی ہوتیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اس گھر میں اس طرح کھانا کھایا، ورنہ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ جب میں دلی آتا تو کھانے کے وقت ریوتی کے ساتھ میں پراٹھے والی



گلی میں جاتا اور پتل پہ بھوجن کرتا۔ پراٹھے والی گلی کا بھوجن کیا ذائقہ والا ہوتا۔ مگر ساتھ میں یہ اندیشہ بھی کھاتا رہتا کہ کہیں یہاں یہ مسلمان بچہ پہچانا نہ جائے۔ مگر خیر اب میں سرلا کی بدولت پتل ایگ سے نکل آیا تھا اور تھال کٹوری ایگ میں سانس لے رہا تھا اور اب میں تھال کٹوری یگ سے بھی نکل آیا ہوں اور ڈنر ٹیبل کے زمانے میں ہوں۔ ریوتی کے گھر میں زمانہ بالکل بدل چکا ہے۔ ڈرائینگ روم کے برابر ایک ڈائننگ روم ہے۔ ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر پوری پراٹھے کھا رہے ہیں۔ میز پر کوئی تھالی کوئی کٹوری نہیں ہے۔ ہمارے سامنے چینی کے پلیٹ ہیں۔ میں پوریوں میں اور ترکاری میں کوئی نقص نہیں نکال سکتا کہ یہ بہرحال روایتی ہاتھوں کی پکائی ہوئی ہیں۔ ریوتی کی بوڑھی ماتاجی پکا پکا کر بھیج رہی ہیں۔ پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ بیچ میں سے کوئی مسالہ کم ہوگیا ہے اور مجھے سیتل پاٹی پر چنی ہوئی تھالی اور کٹوریاں یاد آنے لگتی ہیں۔ اس سیتل پاٹی پر بیٹھ کر اور کٹوریوں میں بھوجن کرتے ہوئے مجھے پراٹھوں والی گلی بالکل یاد نہیں آتی تھی۔ مگر اس وقت یکایک یاد آتی ہے اور میں ریوتی سے کہتا ہوں کہ پراٹھے والی گلی میں کسی دن چلنا ہے اور یہ کہتے کہتے مجھے پنڈت موتی لال نہرو یاد آجاتے ہیں۔ میں چینی کے پلیٹ میں آلو کی ترکاری اور پوری کھاتا جاتا ہوں اور پنڈت موتی لال نہرو کے خلاف کڑھ رہا ہوں۔ یہ اس بزرگ نے کہا تھا کہ کھانے مسلمانوں کے، رسوئی ہندوؤں کی اور ڈائننگ ٹیبل انگریزوں کی، سو پنڈت جی حافظ و سعدی کو پڑھتے تھے اور انند بھون کی رسوئی میں پکا ہوا مرغ مسلم ڈائننگ ٹیبل پر کھاتے تھے اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ کیا "گوپی چند نارنگ کیا بلراج کومل کیا جوگندر پال سب ہی پنڈت موتی لال نہرو بنے ہوئے ہیں۔ جس دوست کے گھر گیا۔ مجھے ڈائننگ ٹیبل پر گوشت کی ڈشیں بھی نظر آئیں اور اب مجھ پر کھلا ہے کہ پنڈت جی نے تین دسترخوانوں کا جو SYNT.HESIS بنایا

تھا۔ اُس نے ہندو کے بھوجن کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے۔ ہمارے یہاں سے جس دن سے وہ دسترخوان لپیٹے گئے ہیں۔ جن پر فارسی اور اُردو کے شعر لکھے ہوتے تھے۔ اور ڈائننگ ٹیبل آئی ہے۔ اس دن سے میرے لئے بریانی اور قورمہ سے آدھا ذائقہ رخصت ہو گیا ہے اور اب میں ہندوستان میں آکر دیکھ رہا ہوں کہ سیتل پاٹی نہ چٹائی، نہ تھالی نہ کٹوری، ڈائننگ ٹیبل ہے اور چینی کے پلیٹ ہیں اور پوری ترکاری کے ساتھ گوشت کی ڈش ہے۔ مگر ریوتی کی ڈائننگ ٹیبل پر گوشت کی کوئی ڈش نہیں تھی۔ پنڈتوں کے اس گھرانے میں آنے والی کائستھ کی بیٹی کو مجھ سے ایک ہی شکایت تھی کہ میں نے ریوتی کو گوشت خوری کی راہ پر کیوں نہیں ڈالا۔ تو خیر اس ڈائننگ ٹیبل پر گوشت نہ دیکھ کر مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ تعجب یہ جان کر ہوا کہ منیرا ابھی گوشت سے پرہیز کرتا ہے۔ پہلے مجھے تعجب ہوا۔ پھر تھوڑا اطمینان ہوا کہ یہ انقلابی اتنا انقلابی نہیں جتنا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔
اس کا طوطا ابھی بالکل بے دم نہیں ہوا ہے۔ مگر مجھے اپنے طوطے کی تلاش تھی۔ آخر میں سات سمندر پار کر کے جو یہاں پہنچا تھا وہ بلاوجہ تو نہیں تھا۔ ریوتی کل جامع مسجد چلنا ہے نا؟"

"بالکل چلنا ہے۔"

جامع مسجد۔ میں اس وقت بہت اُلجھن میں ہوں۔ مجھے اس باب میں کچھ یاد نہیں آ رہا۔ یا شاید میں جان کر بھول گیا ہوں کہ کہیں اُسے بیان نہ کرنا پڑ جائے اور کہیں یہ نہ ہو کہ بیان کے راستے وہ مہک میرے اندر سے رخصت ہو جائے۔ تو بس اب مجھے اتنا یاد ہے کہ مسجد کی بالائی سیڑھی پہ کھڑا تھا اور سامنے دور تک جاتی ہوئی سڑک کو اور چلتے ہوئے بازار کو دیکھ رہا تھا۔ اچھا کوچہ چیلان تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ "یار ذرا تھوڑی دور کوچہ چیلان میں چل کر



دیکھیں"۔۔۔ "ہاں چلتے ہیں" اور ہم سیڑھیوں سے اُتر کر کوچہ چیلان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ میں ہر راہگیر کو اور ہر دوکان کو اور دوکان پہ کھڑے ہوئے ہر گاہک کو غور سے دیکھتا ہوں اور بار بار اپنے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ یہ کوچہ چیلان ہے سارا وہی نقشہ ہے، ہو بہو وہی نقشہ، مگر پھر اس میں سے گم کیا چیز ہو گئی ہے۔ میں اُلجھنے لگتا ہوں۔ مگر ایک چھابڑی میرا رستہ روک لیتی ہے "کھرنی، منو بھائی کھرنی"

"کھرنی کیا" منو بھائی کھرنی سے بالکل ناواقف معلوم ہوتا ہے۔

"یار تم نے کھرنی کبھی نہیں دیکھی" میں جلدی سے تھوڑی کھرنیاں خریدتا ہوں۔ خود کھاتا ہوں۔ منو بھائی کو کھلاتا ہوں "اسے کھرنی کہتے ہیں۔ کیسی ہے۔

"اچھی ہے"

مگر مجھے پتہ ہے کہ منو بھائی کو کھرنی نے کچھ زیادہ پھڑکایا نہیں ہے۔ میں خود بھی اس پھل کا کبھی زیادہ قائل نہیں ہوا۔ مگر چونکہ ایک زمانے کے بعد میں نے کھرنی دیکھی تھی۔ اس لئے میرے لئے اس میں اچانک بہت لذت پیدا ہو گئی تھی۔

ہماری گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں اور ہم کوچہ چیلاں سے باہر نکل آئے تھے۔ اب ہم چاندنی چوک کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ چاندنی چوک کا سارا نقشہ وہی ہے۔ بس بیچ میں سے ٹرام نکل گئی ہے اور گھنٹہ گھر غائب ہو گیا ہے۔ مگر اس سے چاندنی چوک میں کوئی ایسا فرق نہیں پڑا ہے۔ فرق جو پڑنا تھا وہ اب سے بہت پہلے پڑ چکا۔ وہ جو یہاں سڑک کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی زمانہ ہوا پٹ چکی اور اس کے دونوں طرف لہراتے ہوئے آم، جامن، انار اور شہتوت کے پیڑ کٹ چکے اور زر لبفت کی جھولوں اور سنہری روپہلی عماریوں والے ہاتھی رخصت ہو چکے۔ نہ ہوادار نہ پالکی نہ سنہری سنگھوٹیوں والے دودھیا بیلوں سے جتے ہوئے رتھ مگر اس سب کچھ چلے جانے کے بعد بھی چاندنی چوک میں کٹورا تو بجتا رہا تھا۔ میاں آب حیات پلاؤں، کی بولی گونجتی رہی، بہشتی سے آب حیات پی کر پیاس بجھاؤ۔ اہلے گہلے پھر کر آنکھوں کو سیراب کرو کہ راسخ دہلوی جو مضمون باندھ گئے تھے ہنوز بندھا ہوا تھا کہ ؎

دل مرا جلوۂ عارض نے بہلنے نہ دیا
چاندنی چوک سے زخمی کو نکلنے نہ دیا

شربت وصل کا سامان بھی وہیں، عالم فرقت میں بھٹکتے پھرنے کا اہتمام بھی وہیں ؎

جب نہ کاٹے سے کٹیں گھڑیاں فراق یار میں
ہجر کے ماروں نے گھنٹہ گھر کے ٹکڑے کر دیئے

مگر اب چاندنی چوک پر اور زمانہ گذر رہا ہے۔ بھیڑ بھاڑ اب بھی بہت ہے۔ بیشک اب بھی کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ دکانیں صاف و شفاف، صراف کے مقابل صراف۔ ہزاری بزاری پھرتے ہیں۔ تسال دوشالے گہنا پاتا خریدتے ہیں۔ دم بھر میں ہزاروں کا مول کرتے ہیں۔ مگر میں کناٹ پیلس کی گہما گہمی دیکھ آیا ہوں۔ اس رونق سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ چاندنی اب چاندنی چوک میں نہیں کناٹ پیلس میں ہے۔ یہاں اب نہ کٹورا بجتا ہے نہ میاں آب حیات پلاؤں کی بولی سنائی دیتی ہے۔ جیسے سب یہاں سے جا چکے ہوں۔ گھنٹہ گھر غائب، گھڑیاں

سے والے ندارد۔

"یار بلیماروں کو بھی ایک نظر دیکھتے چلیں" میں نے کہا اور ہم بلیماروں میں مڑ لئے۔ کسی گزرے شاعر نے بلیماروں کو دلی کے بیچ اصفہان بتاتا تھا ؎

غالبؔ و شیفتہؔ و ناقبؔ سے بنا ہے گویا
بلّی ماروں کا محلّہ صفہانِ دہلی

میں نے دلی کے اصفہان کو دیکھا اور راستے اندھی گلی پایا۔ ذرا کی ذرا میں پورا کوچہ طے کر لیا۔ آگے رستہ بند تھا۔ کمال ہو گیا نہ شریف منزل دکھائی دی نہ حکیم شریف خان کی مسجد نہ غالبؔ کا مکان۔ تب ہم نے اہلِ کوچہ سے پوچھ گچھ کی اور ان تینوں مقامات کا پتہ چلا لیا۔ اچھا یہ ہے حکیم شریف خاں کی مسجد۔ میں نے اس خستہ حال مسجد کو دیکھا اور حیران ہوا۔ اس کے برابر جہاں کبھی ایک شخص ہمسایۂ خدا بنا بیٹھا تھا اب وہاں لکڑیوں کی ٹال کھلی ہوئی ہے۔ اور شریف منزل۔ میں نے اس ویران ڈیوڑھی کو دیکھا اور سوچا کہ اچھا یہ وہ حویلی ہے جہاں دن میں سیاسی رہنماؤں کا اور رات میں شاعروں کا جمگھٹا رہا کرتا تھا اور چوبیسوں گھنٹے ہندوستان بھر کے بیمار کھینچ کھینچ کر آتے رہتے تھے۔ نکڑ والی دکان پہ بیٹھا ہوا ایک شخص بولا "یاں پہ موتی لال نہرو آیا کرتے تھے۔"

"اب کون آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو کوئی نہیں آتا۔"

مگر میں آیا ہوں، میں نے دل میں کہا اور ڈیوڑھی پہ دستک دی۔ ڈیوڑھی پہ کوئی نہیں تھا۔ تھوڑا اندر قدم رکھا تو ایک صاحبزادہ نظر آیا۔ اس سے پوچھا کہ میاں تم یہیں رہتے ہو نا۔ جی، آپ کو کس سے ملنا ہے۔ میں نے شریف منزل کے دو نام لئے۔ پتہ چلا کہ ایک صاحب سفر پہ گئے ہوئے ہیں اور دوسرے کہ اب اس حویلی کے بڑے ہیں صاحب فراش ہیں۔ میں مسیح الملک کا مطب اور دیوان خانہ نہ دیکھ سکا، ڈیوڑھی ہی سے پلٹ آیا۔ اور



حکیم محمد نبی خان نے مجھ سے کہا کہ اگر تم اندر جا کر مطب اور دیوانِ خانہ دیکھتے تو تمہیں افسوس ہوتا۔

دلی میں افسوس کے مقامات بہت ہیں۔ اس شہر پر کتنے زمانے آئے اور ہر زمانہ جاتے ہوئے افسوس کے کتنے مقامات پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ لال قلعہ ہے۔ اس وقت ہمارے ساتھ دلی کا کوئی یار نہیں ہے اور جن ہمسفروں کے ساتھ ہم شہر کے مقامات افسوس دیکھنے کے لئے نکلے تھے انہیں جامع مسجد کے آس پاس چھوڑ کر ہم دونوں یہاں قلعہ میں آ گئے ہیں اور بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ دور سے تو قلعہ کی فصیل مجھے بہت زندہ اور متکلم دکھائی دے رہی تھی مگر اب جبکہ میں قلعہ کے اندر گھوم پھر رہا ہوں تو کیا سبب ہے کہ اس کے در و دیوار سے میری گفتگو نہیں ہو پا رہی۔ اور ایک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ سنگ مرمر کے یہ در و دیوار میلے ہو گئے ہیں یا مجھے میلے میلے نظر آ رہے ہیں۔ ایوان میں گھومتے پھرتے ہم جھروکے کی سمت بڑھتے ہیں اور باہر جھانک کر دیکھتے ہیں۔ سامنے جمنا ندی آرام میں ہے اور جھروکے تلے ایک بندر والا ڈگڈگی بجا کر اپنے بندر بندریا کو نچا رہا ہے۔ مگر اس کے ارد گرد تماشائیوں کا حلقہ نہیں ہے۔ وہ یہ تماشا کسے دکھا رہا ہے۔ شاید اس نے یہ طے کر لیا ہے کہ جھروکے میں سے جھانکنے والے جمنا کو نہیں دیکھ رہے، اس کے بندر کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میرا دھیان یکایک پیچھے کی سمت میں زقند لگاتا ہے۔ کہیں یہ وہی جھروکہ تو نہیں ہے جس کے نیچے میرٹھ سے چلے ہوئے باغی اکٹھے ہوئے تھے۔ تب سے اب تک کتنا وقت بیت گیا اور جمنا سے کتنا پانی بہہ گیا۔ باغی اور غازی کہانی بن گئے۔ اب ان کی جگہ ایک مداری بندر کا تماشا دکھا رہا ہے اور میں جھروکہ میں سے ایک چونی جیب سے نکال اس کی طرف پھینکتا ہوں۔

ہم وسیع ایوانوں اور لمبے دالانوں میں گھوم پھر کر باہر آتے ہیں اور سبزہ زار میں آ بیٹھتے ہیں۔ منو بھائی سبزہ پہ لمبا لمبا لیٹ جاتا ہے اور سو جاتا ہے۔ ہم دونوں ہی صبح سے گردش میں ہیں اور تھک گئے ہیں۔ مگر میں نے اپنی تھکن اور نیند کو لاہور میں واپسی تک کے

لئے ملتوی کر دیا ہے۔ دلی میں مجھے جاگتا رہنا چاہیئے اور چلتے رہنا چاہیئے۔ تو منو بھائی تھک کر سو گیا ہے مگر میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے۔ میں گھاس پہ بیٹھا ہوں اور ارد گرد بیٹھی ہوئی ٹولیوں کو اور سامنے ایوان میں، غلام گردش میں، اندر باہر لوگوں کو گھومتے پھرتے دیکھ رہا ہوں۔ لال قلعہ میں اتنے لوگ۔ اور اب رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آتا ہے کہ اس قلعہ کے در و دیوار سے میرا مکالمہ کیوں نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس قلعہ کے اندر ایک پورا بازار ہے، دفاتر ہیں اور سیاحوں اور سیلانیوں کا ایک ہجوم ہے۔ ماضی میں حاضر کتنا در آیا ہے۔ یہ عہدِ حاضر کی کھلی جارحیت ہے اور لال قلعہ کی ماضیت خطرے میں ہے۔ دلی اپنے ایک اور ویرانے سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

میں لال قلعہ سے تاج محل تک گیا اور جا بجا ماضی کی اقلیم میں بے وقار عصرِ حاضر کو دخل اندازی کرتے دیکھا۔ سب سے بڑھ کر تاج محل مشکل میں ہے۔ اسے کوئی گھڑی ایسی نہیں ملتی کہ اطمینان سے اپنے ماضی میں سانس لے سکے۔ ہر پہر ہر گھڑی سیاحوں کی یلغار رہتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تاج کو کبھی اس طرح دیکھوں کہ وہاں کوئی نہ ہو۔ خاموش تاج کی کسی برجی پر ایک مور بیٹھا ہو اور بس۔ ہاں سکندرہ کسی قدر امن میں ہے۔ شہنشاہ اکبر کی قبر کو دیکھ کر ہم دونوں باہر نکلے اور مقبرہ کے ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ ارد گرد کچھ اجڑا اجڑا تھا۔ گھاس کہیں تھی کہیں نہیں تھی۔ میرے پاس سے ایک ہرن زقند بھر کر نکل گیا۔ میری نظروں نے اس ہرن کا دور تک تعاقب کیا اور میں نے دیکھا کہ جا بجا ہرن گھوم پھر رہے ہیں۔ اور ادھر کے ایک درخت تلے کچھ بندر دکھائی دیئے کہ درخت پر مستقل چڑھ رہے ہیں اور اتر رہے ہیں۔ مگر بندر کی دم اتنی لمبی تو نہیں ہوتی۔ میں ایک دم سے چونکا "منو بھائی، لنگور۔"

"لنگور؟"

"ہاں یہ بندر نہیں لنگور ہیں۔"



تو میں نے اکبرِ اعظم کی قبر کے ارد گرد غزال دیکھے اور لنگور دیکھے اور رشک کیا کہ دادا پوتے سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ اس کے تعمیر کئے ہوئے قلعہ نے بھی اور اس کے مقبرے نے بھی اپنی ویرانی کو سنبھال کر رکھا ہے اور اپنی ماضی کی فضا کی حفاظت کی ہے۔ مغلوں کے قلعوں میں سب سے اچھا سیکری کا قلعہ رہا کہ کسی بڑے شہر کے نرغے میں نہیں ہے۔ دارالحکومت دلی سے دور ہے اور آگرہ سے پرے ہے۔ ٹورسٹ بھی یہاں زیادہ نہیں آتے۔ ان کا سارا جوش و شوقِ سیاحت تاج محل تک پہنچتے پہنچتے صرف ہو جاتا ہے۔ ایک خاموش بستی کے کنارے حضرت سلیم چشتی کے مقبرے کے متصل یہ قلعہ اپنی ویرانی کی امانت کو سنبھالے خاموش کھڑا ہے۔ سنگِ مرمر کی آرائش سے بے نیاز وہ اپنے سنگِ سرخ میں مگن ہے۔ تاج محل تو ہند اسلامی تہذیب کی شانِ جمالی کا ظہور رہا۔ اس تہذیب کی شانِ جلالی کو دیکھنا ہو تو فتح پور سیکری کے قلعہ کو جا کر دیکھو۔

دلی سے آگرہ، آگرہ سے فتح پور سیکری۔ واپس پھر دلی۔ راستہ میں متھرا پڑتا تھا۔ مگر ہندوستان نے دلی سے آگرہ تک کا نیا راستہ ایسی ترکیب سے بنایا ہے کہ آپ متھرا کی جھلک نہیں دیکھ سکتے۔ اب راستہ میں متھرا نہیں آتا، متھرا بائی پاس آتا ہے۔ میں نے سوچا کہ آخر متھرا کی نگری بھی یہاں سے دور تو نہیں ہو سکتی۔ اور یہیں کہیں برندابن بھی ہوگا۔ وہاں کے اونچے مندروں کے کلس تو دکھائی دیں گے۔ مگر یقین کیجئے کہ میں نے دور تک فضا کا جائزہ لیا۔ کوئی مندر کا کلس دکھائی نہیں دیا۔ اور اب مجھے یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہندوستان کے اس سفر میں میں نے صرف قلعے اور مقبرے دیکھے، مسجدیں دیکھیں، مندر کوئی نہیں دیکھا۔ ایک شام بلکہ پہلی ہی شام ایک راہ سے گزرتے گزرتے ایک پرانا مندر نظر آیا تھا۔ نارنگ صاحب نے بتایا کہ یہ کالکا مندر ہے۔

"کالکا مندر؟" میں چونکا۔

"آپ کو شاید معلوم ہو کہ امیر خسرو۔۔۔۔"

”جی مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”کم از کم امیر خسرو ہی کی تقریب سے اس مندر کو دیکھ لیا جائے۔ میں اس کے اندر جا سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں جا سکتے۔ مگر آج نہیں۔“

پھر ایک دن یوں ہوا کہ پاکستانی زائرین کا پورا قافلہ درگاہوں اور مقبروں کے سفر پر نکلا۔ حضرت بختیار کاکی کی درگاہ، حضرت چراغ دہلوی کی درگاہ، خواجہ باقی باللہ کی درگاہ، صفدر جنگ کا مقبرہ، قطب صاحب کی لاٹھ۔ اور پھر ہماری بس اچانک برلا مندر کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ میں نے منو بھائی کو ٹہوکا ”دیکھ رہے ہو، پاکستانی زائرین مورتیوں کے درشن کریں گے۔“

برلا مندر کی سیڑھیوں پہ چڑھتے ہوئے مجھے ایک بار پھر سرلا کی یاد آئی۔ میں اپنے پہلے سفر میں جنم اشٹمی کے موقع پر دلی پہنچا تھا۔ جنم اشٹمی کی شام میں نے اپنی شیروانی اتار کر الگ رکھی اور ریوتی سے ایک پتلون مستعار لے کر پہنی اور ریوتی اور سرلا کے ساتھ برلا مندر پہنچا اور ڈرتا رہا کہ پہچانا تو نہیں جاؤں گا۔ آج میں اپنی شناخت کو چھپائے بغیر مندر میں داخل ہوتا ہوں، صاحب ریش زائروں کو مورتیوں کے سامنے کھڑا دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ کیا تب سے اب تک کے عرصے میں مندروں کے پنڈتوں اور پروہتوں کو بھی جدیدیت کی ہوا لگ گئی یا ہندوستان نے ٹورزم کے فروغ کی خاطر مندروں کے دروازے غیر مذہب والوں پر کھول دیئے ہیں۔ کیا یہ ہندو مت کے لئے کوئی نیک فال ہے۔

خیر یہ ہندو مت والے سوچیں۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس وسیع ہال میں جہاں میں ابھی ابھی داخل ہوا ہوں اردگرد مہا بھارت کی تصویریں آویزاں ہیں۔ سامنے سری کرشن جی کی قد آدم مورتی کھڑی ہے۔ ایک گوشے میں چوکی پر ایک پجاری بیٹھا بھجن گا رہا ہے۔ میں اس پجاری کی طرف بڑھتا ہوں۔ جب وہ بھجن گا چکتا ہے تو میں دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمستے کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ مہاراج، میرا بائی کا کوئی بھجن سنا دیجئے۔ پجاری مجھے سر سے پیر



تک غور سے دیکھتا ہے، اس پاس کھڑے ہوئے باریش زائروں کو دیکھتا ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہتا، آنکھیں موندتا ہے اور شروع ہو جاتا ہے۔

پایو جی میں تو نام رتن دھن پایو۔ بھجن ختم ہوتا ہے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ پجاری بتاتا ہے کہ ابھی کتھا شروع ہونے والی ہے۔ میں معذرت کرتا ہوں کہ میرے دوسرے ساتھی باہر نکل چکے ہیں وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ کہتا ہے، اچھا ٹھہرو، میں تمہیں شیش محل دکھاتا ہوں۔ شیش محل، تو گویا مندر میں بھی کوئی شیش محل ہوتا ہے۔ غالباً یہ برلا مندر کا خاص الخاص گوشہ ہے جہاں نادر مورتیاں ہونی چاہئیں۔ وہ آدمی کو چابی لانے کے لئے دوڑاتا ہے۔ پھر خود جاتا ہے۔ اور واپس آکر معذرت کرتا ہے۔ کہ جس پجاری کے پاس شیش محل کی چابی ہے وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔ مگر شاید بات کچھ اور ہے۔ مجھ پہ مندر کا ایک پجاری مہربان ہوا تھا۔ سب تو نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے کوئی مندر تو نہیں دیکھا۔ لے دے کے برلا مندر دیکھا۔ مگر برلا مندر کو مندر ماننے میں مجھے تھوڑا تامل ہے۔ اوّل تو یہ نام ہی میرے لئے پریشان کن ہے۔ مندروں کے نام دیوی دیوتاؤں کے نام پر رکھے جایا کرتے تھے۔ ایک صنعت کار کے نام پر مندر کا نام، یہ تو بدعت ہے۔ پھر مندر وہ ہوتا ہے جو ما قبل تاریخ میں سانس لیتا نظر آئے۔ لگے کہ اس کی بنیادیں پاتال میں ہیں اور اس کا کلس پرلوک میں ہے۔ برلا مندر کے ساتھ دقت یہ ہے کہ اس کی کسی دیوار کو کسی کلس کو کائی نہیں لگی ہے۔

ہمارے محافظوں نے آگرہ جاتے ہوئے ایک لالچ دیا تھا کہ آگرہ سے جلدی واپسی کرو گے تو متھرا سے ہوتے ہوئے دلی واپس آئیں گے۔ میں نے اپنے قائد جسٹس گل محمد صاحب سے گزارش کی کہ متھرا میں تو چوبے اور پیڑے ہی نظر آئیں گے۔ آپ ان سے کہئے کہ ہمیں برنداین دکھا دیں۔ مگر یہ منصوبہ پروان نہیں چڑھ سکا کہ ہمیں واپس ہوتے ہوتے رات ہو گئی۔ مجھے اس منصوبے کے پورا نہ ہونے کا اس وقت تو افسوس

ہوا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ جو ہوا ٹھیک ہوا۔ برندابن کے ساتھ بھی وہی ہوا ہوگا جو دلی کے ویرانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ تیا ہندوستان اپنی قدامت کا دشمن ہے اور میں کوئی ٹورسٹ تو ہوں نہیں، بھلا مانس قدامت پسند ہوں۔ سو میرے تصور میں برندابن کا جو نقشہ بنا ہوا ہے اسے کیوں درہم برہم کروں۔ اصل میں قدیم کی وہ بستیاں اچھی رہیں جو مٹ گئیں اور کہانی بن گئیں۔ وہ دیومالائیں اچھی رہیں جن کا اب کوئی ماننے والا دنیا کے تختہ پر موجود نہیں ہے۔ ہندو دیومالا کا المیہ یہ ہے کہ وہ ہنوز ایک مذہب کے طور پر زندہ ہے اور اس کے ماننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہ اس کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ کمزوری یوں کہ اس کے باعث ہندو دیومالا اس احترام سے محروم ہوگئی جو فاصلہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اور مورتیاں ہندوستان میں گھر گھر اور دکان دکان پائی جاتی ہیں۔ کناٹ پلیس سے چاندنی چوک تک وہ کونسی دکان تھی جہاں میں نے گنیش جی اور لکشمی دیوی کی مورتیاں اور تصویریں نہیں دیکھیں۔ اور بھجن مندروں کی ماورائی فضا سے نکل کر فلموں میں پہنچ چکے ہیں۔ بھجن اب کسی پجاری اور کسی داسی کے محتاج نہیں رہے۔ محمد رفیع فلم سٹوڈیو میں بیٹھ کر مندر کے پجاریوں سے کہیں بہتر انداز میں بھجن گا سکتے ہیں۔ سو ہندو دیومالا کی دیوی دیوتا اور بھجن ہندوستان کے باسی کے لئے روزمرہ ہیں۔ وہ اس کے لئے روزمرہ کی سطح سے گزر کر کسی دوسری سطح تک پہنچنے کا وسیلہ کیسے بنیں۔ ہاں لیجئے میں انور عظیم کو بھولا ہی جا رہا تھا۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ تقسیم برصغیر پر ابھی تک پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ منجملہ اسباب پریشانی میری ہجرت ہے۔ بہت محبت سے ملے۔ کہنے لگے کہ آپ کوئل کی بات بہت کرتے ہیں۔ مگر کوئل تو یہاں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں پاکستان اکیلا نہیں گیا ہوں، کوئل میرے ساتھ گئی ہے۔ مگر میں شاید اپنی بات ان تک پہنچا نہیں سکا۔ بولے کہ آپ کے ساتھ ایک کوئل گئی ہوگی۔ یہاں بہت کوئلیں نظر آتی ہیں۔ تب میں نے عرض کیا کہ انور عظیم صاحب کوئل



ایک ہی ہوا کرتی ہے کہ اس کی اکیلی آواز ہی سے فضا بھرتی چلی جاتی ہے۔ بہت سے تو کوّے ہوا کرتے ہیں یا ترقی پسند ادیب ہوتے ہیں۔ ویسے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میں اگر ہجرت نہ کرتا تو ہندوستان کو میری ذات سے کیا فیض پہنچتا۔ یہی ہوتا تھا کہ میں علی سردار جعفری سے ادب کی ہدایت پا کر دوسرا انور عظیم بن جاتا اور ہندوستان کو ایک کی بجائے دو انور عظیم برداشت کرنا پڑتے۔ اس میں طرفین کا نقصان تھا۔ اب میں اور ہندوستان دونوں فائدے میں ہیں۔ ہجرت سے اتنا تو ہوا کہ چیزوں اور منظروں نے نظروں سے دور ہو کر اپنا آپا دکھلایا۔ جامعہ ملیہ کی تقریب میں جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثقافتی تعلقات کی بات کی جا رہی تھی تو میں نے یہی عرض کیا تھا کہ بیشک آپس میں قرب ہونا چاہیئے۔ مگر یارو مت بھولو کہ دوری کے بھی بہت فائدے ہیں۔ میں ایک زمانے کے بعد اس دیار میں آیا تو یاروں نے کس محبت سے گلے لگایا۔ روز روز کی ملاقاتوں سے تو بوریت ہی پیدا ہوتے دیکھی گئی ہے۔ دوری سے قرب پیدا ہوتا ہے۔ اور فاصلہ سے احترام جنم لیتا ہے۔ میں جامعہ ملیہ میں چل رہا ہوں اور حیران ہو کر سوچ رہا ہوں کہ جہاں میں اس وقت چل رہا ہوں۔ وہاں کسی بھلے وقت میں مولانا محمد علی چلا پھرا کرتے تھے۔ مگر یہاں شمیم حنفی اور گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر مسعود حسین صاحب روز چلتے پھرتے ہیں اور انہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا جو اس وقت مجھے آ رہا ہے۔ جامعہ کی زمین پر چلنا ان کے لئے روزمرہ ہے۔ میرے لئے حیرت کا تجربہ ہے کہ میں ایک زمانے کے بعد دلی آیا ہوں اور جامعہ کو تو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

جامعہ ملیہ کی تقریب ختم ہو چکی ہے۔ ریاض مجید نے اپنا کلام سنایا اور داد لوٹی۔ میں نے افسانہ پڑھ کر یاروں سے داد پالی ہے اور جامعہ کے در و دیوار سے اپنے دل میں ہونے کی گواہی لے لی ہے۔ چلتے چلتے میں ٹھٹھکتا ہوں۔ مجھے آہستہ چلنا چاہیئے کہ یہاں کچھ لوگ آرام میں ہیں۔ مجھے ایک بار پھر ڈاکٹر انصاری کا خیال آتا ہے "شمیم صاحب، ہمیں ڈاکٹر انصاری کی قبر پہ بھی تو چلنا تھا۔"

"جی ہاں، اور عابد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہونا تھا"

بس ان دونوں بزرگوں کا خیال بیچ بیچ میں رستہ کاٹتا رہا۔ یاروں کا گھیرا سخت تھا۔ اس گھیرے سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ مگر ایک مرتبہ میں نے قطعی اعلان کیا "دیکھئے صبح کا پروگرام تو میرا طے ہے۔ عتیق صدیقی صاحب تشریف لائیں گے اور مجھے حیات اللہ انصاری سے ملائیں گے۔" یاروں کو جیسے تتئے لگ گئے ہوں۔

"جی ہاں، اس میں ہرج کیا ہے۔ حیات اللہ انصاری ہمارے بزرگوں میں ہیں؟"

"ایک بزرگ پاکستان بھی تو گئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آپ نے کوئی سبق نہیں لیا۔" بلراج مینرا نے مجھے لال پیلی نظروں سے دیکھا۔

میں تو پھر بھی اپنے ارادے پر قائم رہا۔ مگر عتیق صدیقی ہی گول ہو گئے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں اسی شب ایک بہشتی سے ملا اور بہشت میں پہنچ گیا۔ رات گئے ڈیرے پر واپس ہوتے ہوئے میں نے سوچا کہ افسوس ہے مجھ پر کہ ادیبوں سے ملتا پھرتا ہوں اور دلی کی خلقت سے کہ ان شبوں میں محبوب الٰہی کی درگاہ پر اُمڈی ہوئی ہے کٹنی کاٹ رہا ہوں۔ اور یہ کہ محبوب الٰہی تک رسائی محض فاتحہ پڑھنے کو اور پھول چڑھانے سے تو نہیں ہو جاتی، وہ تو اسی خلقت کے وسیلہ سے ہوتی ہے۔ سو ہم یار ڈیرے پر جاتے جاتے درگاہ کی طرف ہو لئے۔ واہ کیا عالم تھا۔ میں تو افتتاحی تقریب دیکھ کر یہ سمجھ سا گیا تھا کہ عرس اور اتنا ٹھنڈا۔ اب احساس ہوا کہ دلی کے سیلانی تو بھیگتی رات کے ساتھ پھریری لیتے ہیں اور عقیدتمند بارہ کے گجر کے بعد جاگتے ہیں۔ عقیدتمندوں کا اژدہام تھا۔ مجمع خاص و عام تھا۔ گل فروشوں کی دکانوں پر گلاب کی ڈھیریاں لگی تھیں۔ ایک مہک گلاب کی، ایک مہک اگر کی، سب سے بڑھ کر مہک عقیدت کی۔ بس یہ کوچہ طبلۂ عطار بنا ہوا تھا۔ ہر آدمی سراپا عقیدت بن کر درگاہ کی طرف دوڑا جاتا تھا۔ ہم بلٹے کہ ہم تو خلقت سے ملاقات کی راہ محبوب الٰہی تک پہنچیں گے۔ پلٹ کر جو ایک



رستے پہ گئے تو کیا دیکھا کہ چولہوں پہ کڑھائیاں چڑھی ہیں۔ ہاتھی کے کان سے بڑے پراٹھے تلے جاتے ہیں۔ حلوہ نرم نرم، کباب گرم گرم۔ کھانے انواع واقسام کے، کھانے والے رنگ رنگ کے۔ کرخنداری بولی جو سنائی پڑی تو اب پتہ چلا کہ دلی آئے ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا، آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔ اسی ریل پیل میں دیکھا کہ ایک سقہ کمر پہ مشک لادے پھرتا ہے۔ ہاتھ میں کٹورا جھمکتا ہوا جیسے چاندی کا۔ کٹورا بجاتا ہے، کوثر کے گھونٹ کا مژدہ دیتا ہے۔ میں نے منو بھائی سے کہا کہ پانی پئیں۔ مشک کے دہانے سے نکلا ہوا پانی اور پھر چھمکتے ہوئے کٹورے ہیں۔ میں نے غٹاغٹ پیا۔ برس برس کی تشنگی کو دور کیا۔ اب جی ٹھنڈا تھا۔ طبیعت سیر تھی۔ چاندنی چوک میں کٹورا نہیں بجتا تو کیا ہوا۔ اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر دیگچے نہیں کھنکتے تو کیا ہوا۔ آتے جاتے زمانوں نے وہاں ہمیشہ ہی نئے نئے رنگ دکھائے جامع کی سیڑھیوں سے سن ستاون کی رستاخیز میں کتنے رخصت ہوئے کہ پھر واپس نہیں آئے۔ پھر ۴۷ کے فساد میں یہاں سے کتنے رخصت ہو گئے اور دور کی بستیوں میں جا نکلے۔ اب جو رخصت ہوئے ہیں، وہ تیچے نئے بنے ہوئے بازار میں جا بیٹھے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر زردہ پلاؤ بیچتے ہیں اور سیڑھیاں صاف ہیں۔ دکانوں سے پاک ہیں۔ وقت ان سیڑھیوں پر کبھی ٹھہرا نہیں رہا۔ مگر محبوب الٰہی کی درگاہ پہ وقت مؤدب کھڑا ہے۔ وہی پرانا نقشہ ہے۔ دیگیں کھنکتی ہیں۔ کٹورا بجتا ہے۔ کرخنداری بولی کا طوطی بولتا ہے۔ سیلانی بیڑے کھاتے ہیں، پان کلے میں دباتے ہیں اور تھیٹر کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ تھیٹر وہی پرانی شان والے۔ شامیانے تنے ہیں، قناتیں کھڑی ہیں۔ پردوں پہ عجیب الخلقت شکلیں بنی ہیں۔ برابر میں ہنڈولے ڈولتے ہیں۔ بچے بڑے ان میں بیٹھ کر چکر کھاتے ہیں۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ اس مبارک درگاہ پر برس کے برس عرس کے سمے لٹی دلی اپنی روشن راتوں کے سنگ یہاں براجتی ہے اور رتجگا کرتی ہے۔

"یار ہمیں دلی کی صبح بھی تو دیکھنی چاہئے۔" میں نے پلنگ پہ لیٹتے ہوئے آدھے

سوتے آدھے جاگتے منو بھائی سے کہا اور سو گیا۔

مگر صبح منہ اندھیرے ہم دونوں کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں ملتے اٹھے اور بس تیر کی طرح باہر ——!

"چلو دیکھتے ہیں کہ مقبرے کے عقب میں کیا ہے"۔

فصیل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم مقبرہ ہمایوں کے عقب میں جا نکلے۔ یہاں کھلے میدان میں ایک تختی نصب تھی جس پہ لکھی ہوئی عبارت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں گوردھن سیٹھ کا بیٹا بہادر شاہ ظفر کے ہاتھی سے لڑا تھا اور غالب آیا تھا۔ منو بھائی اس عبارت کو پڑھ کر پہلے حیران ہوا، پھر ہنسا۔

میں نے کہا: "برادر ہنسنے اور حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آخری دنوں میں مغلوں کے ہاتھیوں کا حال کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا"۔

ہمارے پاس گنتی کی صبحیں ہیں۔ ہم ان صبحوں کو غنیمت جانتے ہیں۔ روز منہ اندھیرے اٹھتے ہیں اور چل پھر کر دلی کے درختوں اور چڑیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس نواح میں کھڑی ہوئی املی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے۔ میں اس راہ سے گزرتے ہوئے یہاں ادب ادا کر کے رکتا ہوں۔ املی تلے گری ہوئی ننھی ننھی زردی مائل ہری پتیاں چن کر زبان پہ رکھتا ہوں اور کھٹاس محسوس کرتے ہوئے کہتا ہوں:

"یہ دلی کی املی ہے"۔

اب یہاں چلتے ہوئے مجھے اپنے قدموں کی آہٹ سنائی نہیں دیتی۔ میں ان راہوں سے مانوس ہو چکا ہوں جیسے جنم جنم سے یہاں چل رہا ہوں۔ مقبرہ ہمایوں کی فصیل اب مجھے متحیر نہیں کرتی۔ اس فصیل کے متصل چلتا رہتا ہوں، اسے چھو کر نہیں دیکھتا۔ ہاں اس کے بند دروازے کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہوں۔ اس میں آنے جانے کا بڑا پھاٹک دوسری طرف ہے جہاں سے سیر کرنے والے، پکنک منانے والے گزرتے ہیں۔ مجھے اس پھاٹک سے اندر جانے اور



مقبرے کو دیکھنے کی کوئی خواہش محسوس نہیں ہوتی۔ مگر جنگلے والے اس مقفل دروازے کو دیکھ کر میں ٹھٹکتا ہوں۔ جنگلے میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ مجھے بہادر شاہ ظفر کا خیال آتا ہے، پھر بخت خاں پہ دھیان جاتا ہے۔ بخت خاں۔ وہ یہاں سے نکل کر کن راستوں پہ چلا تھا۔ اور کدھر نکل گیا تھا۔ اور اچانک بستی نظام الدین کے مانوس رستے میرے لیے عجب اور اجنبی بن جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ بس ابھی ابھی کسی آس پاس کے رستے سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئے گی۔ بس انھیں رستوں میں سے کسی رستے وہ گیا ہوگا اور یہیں کہیں وہ جھاڑیاں تھیں جہاں سے مور نے مجھے پکارا تھا۔ مور نے بخت خاں کو بھی پکارا تو ہوگا۔ دلی جانے والوں کو ایکبار ضرور پکارتی ہے۔

دلی کی خوش تو صبحیں اڑتی جا رہی ہیں اور دن میری انگلیوں کے بیچ سے پھسلتے جا رہے ہیں۔ آج میں بہت صبح اٹھ بیٹھا ہوں۔ سمجھ لو کہ نور کے تڑکے آنکھ کھلی۔ منو بھائی کو اٹھایا اور دونوں نکل کھڑے ہوئے۔ کبھی شاہراہ پہ کبھی شاخ در شاخ راہوں پر۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ آج پوری بستی نظام الدین کو کھونڈ ڈالوں۔ اور پوری صبح کو اپنے مساموں میں بسا لوں۔ چلتے پھرتے ہم درگاہ والے بازار میں جا نکلتے ہیں۔ یہ کیا، میلہ تو اجڑ گیا۔ تھیٹروں کے شامیانے اور پردے اتارے جا رہے ہیں۔ دکانداروں کے ڈیرے تنبو اکھڑ چکے ہیں۔ چولہے بجھے پڑے ہیں۔ خالی دیگیں ریڑھوں ٹھیلوں پہ لد رہی ہیں۔ پورا بازار کہ رات شاد و آباد تھا ٹھنڈا پڑا ہے نہ کٹورا بجتا ہے نہ دیگیں کھنکتی ہیں۔ جہاں تہاں پڑی ہوئی خالی تھالیں، جھوٹے برتن، الٹی میزیں، تپائیاں، ٹھنڈی راکھ کی ڈھیریاں، آگ بجھی ہوئی۔ ادھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر۔ تو کارواں رات رات میں رخصت ہو گئے۔ تو میں دلی میں یہ آخری صبح کر رہا ہوں۔

دلی میں یہ میرا آخری دن ہے۔ اس دن کے ساتھ میری دوڑ بدی ہے مگر مجھے تو زبیر رضوی نے باندھ کے اردو مرد میں بٹھا لیا ہے اردو مرد میں اس وسیع و عریض

سٹیشن کے ایک کمرے میں سمٹی ہوئی ہے۔ میز سے میز بھڑی ہوئی ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے یونہی مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں آس پاس ایرانیم اور ادشا ٹنڈن ہوں تو انہیں خراجِ تحسین پیش کروں۔ مگر میں تو اس وقت زبیر رضوی کے سوالوں کے نرغے میں ہوں۔ خیر اس عزیز کو سوال کرنے کا سلیقہ اور بات اگلوانے کا گر آتا ہے مگر وہ اس فن میں کشور ناہید کو داد دینے پر تلا نظر آتا ہے۔

"صاحب۔ آپ کے یہاں کشور ناہید خوب انٹرویوئر ہیں"۔

ریڈیو سے نکلا ٹی وی میں اٹکا۔ یہاں پھر انٹرویو۔ خدا خدا کرکے یہاں سے نکلا۔ اب میں، منو بھائی اور منیرا واقعی دوڑ رہے ہیں۔ خریداری بھی کرنی ہے اور ادھر نارنگ صاحب ہمارے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہوں گے۔ بھاگ دوڑ میں خریداری کی مگر جس مورتی کی مجھے تلاش تھی وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے متھرا کے نواح میں ایک دکان سے مٹی کے بنے ہوئے دو طوطے خریدے تھے۔ دل سے کہا کہ زیادہ ہوس اچھی نہیں یہ طوطے تیرے لئے بہت ہیں۔ بھاگم بھاگ نارنگ صاحب کے یہاں پہنچے۔ اب پانچ بج رہے تھے اور ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ لقمہ منہ میں ہے اور دھیان قافلہ کی طرف ہے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ چل پڑے اور ہم پیچھے رہ جائیں۔ آخری لقمہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نارنگ صاحب ہاتھ میں ایک ریکارڈ تھما دیتے ہیں:

"دیکھئے گیتا دت کا لانگ پلے تیار ہی نہیں ہوا۔ جوتیرکا راٹے کو لیجائیے"۔

جوتیرکا راٹے۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ اور ہاں عظیم الشان صدیقی صاحب نے بھی ایک شے مجھے دی تھی۔ میرا بائی کا انتخاب۔ میرا بائی، جوتیرکا راٹے، مٹی کے دو ہرے ہرے طوطے۔ ندیدے! ہندوستان کا اصلی مال تو تو لے چلا ہے اور تجھے کیا چاہئے۔

دن کے ساتھ دوڑ ختم ہوئی۔ رخصت کی رات آگئی۔ گاڑی ہماری تیار کھڑی ہے۔ بلراج مینرا، زبیر رضوی، محمود ہاشمی، شمیم حنفی، بلراج کومل۔ دوست آتے چلے جارہے



ہیں۔ رخصت کی گھڑی قریب آتی چلی جارہی ہے۔ شمیم حنفی کہہ رہے ہیں کہ آپ تھوڑا رک جاتے تو پھر ہم علی گڑھ چلتے اور وہاں سے آپ اپنی ڈبائی کا پھیرا بھی لگا سکتے تھے۔

کیا کہا۔ ڈبائی؟ کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں۔ اچانک میرے تصور میں علی گڑھ سے ڈبائی تک کے رستے اپنی اڑتی گرد اور ڈولتے اکوں کے ساتھ منور ہو جاتے ہیں اور مجھے ایک تشویش بھرا خیال آیا۔ میں نے شمیم حنفی سے ایک بات پوچھی تھی کہ دلی کے کوچوں میں ڈولی اب بھی چلتی ہے۔ نہیں ڈولی اب یہاں نہیں چلتی۔ اور اب میں فکرمندی سے سوال کرتا ہوں کہ شمیم صاحب! علی گڑھ اور ڈبائی کے رستوں میں اکے اب بھی چلتے ہیں نا!

"جی۔ اِکے اب بھی چلتے ہیں"۔

"سڑکیں وہی کنکروں والی ہیں نا۔" "تارکول سے پاک"۔

"جی بالکل۔ ان سڑکوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے"۔

تب میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔ ہندوستان کو ترقی کی نئی راہیں مبارک ہوں مگر میں اپنی چھوڑی ہوئی بستی کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اس کے گرد آلود رستے اپنے اکوں اور بیل گاڑیوں کے ساتھ سدا شاد و آباد رہیں۔ اس کے کڑوے نیموں پہ برسات کی برسات نبولیاں پھولتی رہیں اور اس کی اونچی املیوں پہ جاڑوں کے جاڑوں ملبی گٹاریں لگتی رہیں اور طوطوں کی ڈاریں اترتی رہیں۔

سیٹی بج چکی۔ ریل چل پڑی۔ میں دلی کو رخصتی سلام کرتا ہوں۔ بستی نظام الدین کو، کوچہ بلیماراں کو، قطب صاحب کی لاٹھ کو، لال قلعہ کی خاموش فصیل کو، جامع مسجد کی خالی سیڑھیوں کو۔ ع

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

# بندر کی دُم

بھیم اپنی مہم پر کالے کوسوں چلا جا رہا تھا کہ بیچ راستے میں ایک بندر بیٹھا دکھائی دیا۔ ڈھوڑ کا ڈھوڑ۔ بدن سونے کی طرح چمکتا ہوا۔ بھیم سے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں سو میں تو یہاں سے نہیں اٹھوں گا۔ تجھے نکلنا ہے تو نکل جا مگر دُم سے ذرا بچ کے نکلنا۔ بھیم نے سوچا کہ چھوٹی سی تو دُم ہے، میں اس سے ذرا پرے ہٹ کر نکل جاؤں گا مگر وہ جتنا پرے ہٹتا گیا دم اتنی ہی پھیلتی گئی۔ سو وہ دم سے بچ کر نکل سکا نہ دم کو پھلانگ سکا۔

ایسا بندر تو مجھے سفر میں کوئی نہیں ملا۔ مل بھی نہیں سکتا تھا۔ مسافر میں جتنا دم خم ہوتا ہے، اسی کے حساب سے اسے بندر ملتا ہے۔ میرے لئے وہ بندر بہت تھا جو علی گڑھ اور ڈبائی کے درمیان سڑک کے بیچوں بیچ ہاتھ پیر پھیلائے آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ کار کے ہارن کو سن کر اس نے آنکھیں کھولیں، بے دلی سے اٹھا اور قریب والے پیڑ پر چڑھ گیا۔ اس کا پورا کنبہ بھی جو آس پاس لیٹا بیٹھا تھا تابعداری سے اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا درخت پر چڑھ گیا۔ آگے سڑک صاف تھی، کچھ بہت ہی صاف۔ میں کتنا حیران تھا کہ خالی کنکروں والی سڑک اپنے گڑھوں اور گرد کے ساتھ غائب ہو گئی ہے۔ اب وہاں تارکول والی چکنی ہموار سڑک بچھی ہوئی ہے۔ اچھا یہ رستہ زورہ کو جاتا ہے۔ ارے یہ تو دانپور آ گیا۔ یہ تو وہی اجاڑ ویران مقبرہ ہے جسے دیکھ کر میں سمجھ جاتا تھا کہ بس اب دانپور آنے والا ہے۔ مگر ڈبائی کے کنارے پہنچ کر

سارے نشان گم ہو گئے۔ یا اللہ یہ کونسی سڑک ہے۔ اگر یہ وہی رستہ ہے جس رستے یہاں باہر سے آنے والی لاریاں، بیل گاڑیاں اور اِکے پہنچتے تھے تو اس رستے میں تو روڈی کا ایک بیچ بھی تھا جس کا اونچا موٹا ستون دور سے اپنے وجود کا اعلان کرتا تھا۔ اور وہ ہسپتال بھی تھا جس کے اردگرد بہت پھلواری تھی اور بہت تتلیاں اڑا کرتی تھیں اور وہ کوٹھی بھی تھی جس کے اردگرد پھیلے ہوئے گھنے باغ سے مور کی پکار بہت صاف سنائی دیا کرتی تھی۔ وہ سب کچھ کہاں چلا گیا اور پھر وہ سڑک کہاں ہے جو اندر جاتی تھی اور ہمارے محلہ میں جا کر نکلتی تھی۔ تو یہاں آ کر مجھے کسی سے رستہ پوچھنا پڑے گا۔ نہیں ـــ کچھ دیر مجھے اس راہ پر بھٹکنا چاہئے۔ پھر میں رستہ پہچان لوں گا۔ مگر آخر کتنی دیر۔ آخر ابوالکلام قاسمی نے کسی راہ چلتے سے رستہ پوچھا مگر اندر داخل ہوتے ہوتے میں پلٹ پڑا۔ ڈرائیور سے کہا کہ واپس چلیں۔

"کیوں؟" ابوالکلام قاسمی نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"بس واپس چلیں"۔

اب جبکہ اس سفر کو پیچھے خاصے دن گزر چکے ہیں تو بات دھیرے دھیرے میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ محض میری خوش فہمی تھی۔ بندر رستے میں سے نہیں ہٹا تھا اور میں دم کو نہیں پھلانگ سکا تھا۔ مگر میں نے ابوالکلام قاسمی سے کچھ اور بات کہی تھی:

"یار بات یہ تھی کہ مجھے اپنا ایک خواب یاد آ گیا تھا"۔

"کونسا خواب"؟

"وہ خواب جس میں میں اپنی اس چھوٹی سی بستی میں داخل ہوتے ہوئے رستہ بھول جاتا ہوں سب رستے عجیب اور اجنبی نظر آتے ہیں۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ میرا پاسپورٹ کہاں ہے اور ایک اجنبی چلتے چلتے مجھے گھور کر دیکھتا ہے۔ اور وہ خواب ـــ خیر خواب بہت سے ہیں۔ ان تیس بتیس برسوں میں جانے میں نے کتنے خواب دیکھے، خواب ہی خواب میں کتنا کتنا چلا،



کن کن گلیوں سے چھوڑے ہوئے ٹھکانوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر ہر مرتبہ یہی ہوا کہ یا رستہ بھول گیا یا بیچ میں آنکھ کھل گئی۔ اب وہ سب خواب میرے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ کوئی بھی خواب کسی بھی لمحے عین بیچ میں آن کھڑا ہوتا اور پھیلتا چلا جاتا، پھیلتا چلا جاتا۔ آدمی کے خواب آدمی کو کتنا پریشان کرتے ہیں۔ میں دلی میں اچھا بھلا چل پھر رہا ہوں مگر دل میں ایک کھٹکا سا لگا ہوا ہے کہ کہیں بیچ میں آنکھ نہ کھل جائے۔ شکر ہے کہ اس پورے عرصے میں آنکھ نہیں کھلی۔

آنکھ کھلی تو میں لاہور میں تھا۔ اب میں جاگ چکا ہوں۔ خواب اور میرے درمیان اب ایک فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ اب میں اس خواب کو یاد کر سکتا ہوں مگر صرف جہاں تہاں سے۔ ایک طرف جمنا کا شانت پانی۔ دوسری طرف گیندے کے کھیت۔ بیچ میں وہ بوڑھا برگد جس میں بندروں کی ایک پوری برادری آباد ہے۔

"انتظار صاحب آپ پچھلی مرتبہ آئے تھے تو واپس جا کر یہ شکایت کی تھی کہ دلی میں مور دکھائی نہیں دیا۔ اس طرف مور بہت ہیں"۔

اور میں شمیم حنفی کے ہمراہ دلی میں اپنی اس پہلی صبح کے دھندلکے میں دور تک جاتا ہوں۔ گیندا بہت پھولا ہوا ہے۔ گل چیں اپنے کام سے لگے ہیں۔ گیندے سے ٹوکریاں اور بورے بھرے جا رہے ہیں۔ گیندے کے کھیتوں سے پرے نالے کے اس پار ٹیلے پہ ایک صراحی دار نیلی نیلی گردن ابھرتی ہے، پھر دوسری، پھر تیسری۔ مور ہی مور۔ کس اطمینان سے چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ایک لمبی جھنکار جس سے پوری فضا میں ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ صبح کی سیر مکمل ہوئی۔ ہم واپس ہوتے ہیں اور پھر اسی بزرگ برگد کے حضور۔ بندر اب جاگ اٹھے ہیں۔ ایک بندریا کے سوا۔ اس کی نیند گہری ہے۔ ایک موٹے آرام دہ گدے پہ کروٹ لئے ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے سو رہی ہے۔ سونے کے اس انداز سے میں شک میں پڑ جاتا ہوں۔ کیا یہ بندیا بندریا ہی ہے۔ ایک بوڑھا بندر درخت سے اترا، سڑک کو عبور کر کے پل کے کنارے جا بیٹھا ہے اور برابر سے

گزرتے لڑکوں اور راہ گیروں کو ایک بے تعلقی سے دیکھ رہا ہے۔

"انتظار صاحب! اس برگد کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ اسے آلھا اودل نے لگایا تھا"۔

"آلھا اودل"۔ میں چونکتا ہوں اور ایک دم سے ڈبائی میں جا پہنچتا ہوں۔ فقیرا حلوائی کی دکان کے سامنے موری کے برابر پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی۔ کچھ چارپائی پر بیٹھے ہوئے کچھ دکان کے تھڑے پر کچھ نالی کے کنارے منڈیر پہ ؏

مارا جھونٹا جب سکھیوں نے جھونٹا لگا سرگ میں جائے
پروا ہولے چلے ساون کی ساری بن سپتی لہرائے

جھونکا لگ گیا جب پروا کا چونری مچلا کی اڑ جائے
گھونگھٹ اٹھے جب رانی کا چہرہ دمک دمک رہ جائے

اور بھیا اب دوہا سنو ـــ

ایک تو دھکا اس کو لگ جا جس کا گھر ساون میں گر جائے
دوسرا دھکا اس کو لگ جا جس کی لین بھینس مر جائے
تیسرا دھکا اس کو لگ جا جس کی بھری چلم گر جائے!
چوتھا دھکا اس کو لگ جا جس کا جوان پوت مر جائے!

اردو سروس کے نگرانِ اعلیٰ کول صاحب پوچھنے لگے کہ اردو سروس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو کمیاں نظر آتی ہوں وہ ہمیں بتایئے۔ کچھ سجھایئے"۔

میں نے عرض کیا:

"آپ کا ایک پروگرام ہوتا ہے اُتر پردیش کے گیت۔ جب سے اردو سروس شروع ہوئی ہے وہی چند گنے چنے گیت آپ سنوا رہے ہیں۔ اتر پردیش شاید گیتوں کے معاملہ میں اتنا غریب نہیں ہے اور اتر پردیش کی خاص الخاص رزمیہ تو آپ نے آج تک نہیں سنوائی"۔

"وہ کونسی رزمیہ ہے"۔



"آلھا اودل"۔

"اچھا آلھا اودل۔ اردو سروس سے کبھی نہیں ہوئی۔ کیوں مسٹر محمود ہاشمی"۔

محمود ہاشمی نے وضاحتیں کیں۔ کول صاحب نے معذرت کی:

"اب سنوائی جائے گی"۔

اردو سروس نے اردو کی اس لوک رزمیہ کو درخورِ اعتنا نہیں جانا مگر اسی شہر میں جامعہ ملّیہ سے پرے ایک بوڑھا برگد کھڑا ہے جس کے بارے میں یہاں کی جنتا کہتی ہے کہ اسے آلھا اودل نے لگایا ہے۔ میں اس برگد کو، اس میں جھولتے بندروں کو دیکھتا ہوں اور فوراً باور کر لیتا ہوں۔ اور ایک بندر تنے کے پاس سے اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھتا ہے۔

"شمیم صاحب۔ اس بندر نے مجھے پہچان لیا ہے"۔

میں خوش ہوں کہ آلھا اودل کے برگد کے ایک باسی نے مجھے پہچانا۔ مگر وہ اچانک اچکتا ہے۔ اور میرے ہاتھ سے گیندے کا پھول چھین کر یہ جا وہ جا۔ اس کے حامی مجھے کھانے کو دوڑتے ہیں۔ مگر آخر کیوں۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا ہے۔ پھول واپس دینے کا کوئی تقاضا نہیں کیا ہے۔ دلی میں میری دوسری صبح کی سیر بھی سپھل ہوئی۔

میں خوش ہوں کہ جامعہ نگر میں میرا بسیرا ہے ورنہ ہندوستان کے ان قدیم و عظیم باسیوں سے ملاقات کا شرف کہاں حاصل ہوتا۔ جنپت ہوٹل سے میں بال بال بچا۔ جب ہم جہاز سے دلی میں اترے تھے تو دوستوں کی شکلوں کے بیچ ایک شکل اور بھی نظر آئی تھی۔ گوری رنگت بوٹا سا قد، ماتھے پر لال بندیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ نارنگ صاحب نے تعارف کرایا:

"آپ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی طرف سے آپ کا استقبال کرنے آئی ہیں۔ آپ لوگ ہفتے بھر تک آئی سی سی آر کے مہمان رہیں گے اور جنپت میں قیام کریں گے"۔

مگر میرا معاملہ ذرا مختلف ہو گیا تھا۔ بیگم جو ساتھ تھیں۔ اور ہوائی اڈے سے باہر قدم

دیکھتے ہی بینو نے دبوچ لیا۔

"انکل۔ میں ہوں بینو۔ پاپا اس وقت پیرس میں ہیں مگر میں نے انہیں اطلاع دے دی ہے کہ آپ آج دلی پہنچ رہے ہیں۔ انہیں آنے میں دو تین دن لگیں گے۔ مگر میں ہوں۔ ڈمپو ہے۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ میں نے نارنگ صاحب سے پوچھ لیا ہے۔"

میں نے شمیم حنفی کی ملتجی نگاہوں کی طرف دیکھا۔ سوچا پھر کہا کہ "میاں آخر میں تو تمہیں ہی بور کرنا ہے۔ اب کے اس شہر میں خوب خاک اڑا کر جاؤں گا۔ مگر ابھی میں سیمینار میں معروف رہوں گا۔ اتنے میں ریوتی بھی واپس آجائے گا۔ بس پھر ہم ہوں گے اور تم ہوگے۔"

تو میں جامعہ نگر میں ہوں۔ شمیم حنفی کے ساتھ۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ہمیش جنپت میں۔ احمد ہمیش جنپت میں کتنا خوش ہے کہ فوٹو گرافر کو خصوصی طور پر بلا کر اپنی تصویریں کھنچوا رہا ہے کبھی فوم کے گدے والے بستر میں لیٹ کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی کھڑے ہو کر۔ میں جامعہ نگر میں کتنا خوش ہوں، جس گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں اسے بسیرا کہتے ہیں۔

"انتظار صاحب۔ آپ جس کمرے میں ہیں اس میں عابد صاحب بیٹھ کر اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب قرۃ العین حیدر جامعہ میں آکر رہی تھیں تو وہ بھی اسی کمرے میں آکر ٹھہری تھیں۔"

پھر ہم باہر نکلتے ہیں:

"انتظار صاحب۔ برابر میں درختوں میں گھرا ہوا جو گھر نظر آرہا ہے یہاں خواجہ غلام السیدین رہتے تھے اور یہ عابد ولا ہے۔ اب یہاں صالحہ عابد حسین ہیں۔ اور ان کی صغریٰ مہدی۔ وہ والی کوٹھی ہمارے وائس چانسلر جمال صاحب کی ہے۔ قرۃ العین حیدر وہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔ اور یہ سامنے راماچندرن رہتے ہیں۔"

چلتے چلتے شمیم حنفی ٹھٹکتے ہیں:

"یہاں مجیب صاحب رہتے ہیں۔"



"کسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے۔"

"اب ان سے ملاقات مشکل ہے۔ ان کی یادداشت ختم ہو چکی ہے۔ لکھنا پڑھنا بھول گئے ہیں۔ پھر سے الف، ب، ت پڑھنی شروع کی ہے۔"

اب میں نگر کے درختوں سے تعارف چاہتا ہوں اور پرندوں سے۔

"شمیم صاحب۔ یہ کونسا درخت ہے۔"

"درختوں کے بارے میں آپ کو راماچندرن بتا سکتے ہیں۔ وہ شخص ایک ایک درخت کو پہچانتا ہے۔ اور ہاں میں نے آپ کے افسانے میں اشوک کے پھولوں پر اعتراض کیا تھا، وہ میں واپس لیتا ہوں۔ راماچندرن نے بتایا کہ اشوک پر پھول آتے ہیں۔ سیتا جی نے اشوک کو ٹھوکر ماری تھی بس وہ اس دن سے پھول لانے لگا اور وہی بات جو آپ نے لکھی ہے کہ جب کوئی کنواری کنیا اسے ٹھوکر مارتی ہے تب اس پر پھول آتے ہیں۔"

میں صبح کے دھندلکے میں چلتے چلتے ٹھٹکتا ہوں:

"یہ کوئی قبرستان ہے۔"

"جی، یہ جامعہ کا قبرستان ہے۔"

"اچھا تو یہ ہے جامعہ کا قبرستان۔ جب میں پچھلی مرتبہ آیا تھا تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر انصاری کی قبر پر چلنا ہے۔"

میں سیڑھیاں چڑھتا ہوں۔ یہ ڈاکٹر انصاری کا مزار ہے اور یہ خواجہ غلام السیدین سو رہے ہیں۔ اور یہ ڈاکٹر عابد حسین کی آرام گاہ ہے۔ اچھا یہ سجاد ظہیر ہیں اور یہ اونچا مقبرہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا ہے۔

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

دلی میں صبحوں میں کیا کیا لوگ ملے۔ منہ اندھیرے کوئل کی پہلی پکار پر اٹھنا اور نکل کھڑے ہونا۔ پل کو پار کر کے نالے کے برابر برابر گیندے کے کھیتوں کو کھوندتے ہوئے وہاں پہنچنا،

جہاں مور پُر وقار انداز میں چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے۔ ان سے مل کر پلٹنا اور آلہا اودل کے برگد پر منزل کرنا۔ بندروں سے ملاقات کرنا اور پھر دن بھر ادیبوں سے ملاقات کرنا۔

نارنگ صاحب نے کیا کیا آدم جمع کیا تھا۔ ہندوستان میں امرتسر سے گیا تک اور ہمالہ سے راس کماری تک چار دانگ اس سیمینار کی گونج گئی تھی۔ شہر شہر سے افسانہ نگار کھنچ کر آئے تھے۔ بہاری افسانہ نگار موج در موج تھے۔ غیاث احمد گدی اور رضوان احمد نمایاں تھے۔ بمبئی نے اپنے تین بڑوں کو بھیج دیا تھا۔ عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر۔ مگر سریندر پرکاش کے پیر جکڑ لئے۔ کراچی سے نادرۂ روزگار احمد ہمیش، سرگودھا سے ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور کا یہ روڑا انتظار حسین۔ امریکہ سے محمد عمر میمن اور پاکستان ہندوستان فہیم والی لنڈا وِنٹنیک۔

جامعہ ملیہ میں شامیانہ تنا تھا۔ افسانے کا سٹیج سجا تھا۔ پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا جیسے چھوٹا وہ بیچ میں سے افسانہ نگار نکلا۔ یا اللہ ہندوستان میں اتنے افسانہ نگار ہیں۔ اردو دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ تیسری دہائی میں بھی اس نے افسانہ نگار بہت جنے تھے۔ اس دہائی میں بھی اس نے افسانہ نگار بہت دے ڈالے اور سب کے سب تجریدی۔

کیا صابر و شاکر سامعین تھے۔ کیسے کیسے لمبے مقالے پڑھے گئے۔ سیشنوں نے کیا کیا طول پکڑا۔ مگر مجال ہے کہ کوئی صف خالی نظر آئے۔ اسی تحمل سے افسانے کی محفلوں میں افسانے سنے گئے۔ کتنے اچھے تھے وہ لوگ کہ جس یکسوئی سے انہوں نے پہلی محفل میں احمد ہمیش سے افسانہ یعنی ان کے ایک طویل افسانے سے اقتباس سنا تھا، اسی یکسوئی سے ہر محفل میں اس افسانے کو یا اس اقتباس کو سنتے چلے گئے اور جب ایک خاص مقام پہ پہنچ کر احمد ہمیش پر رقت طاری ہوتی تو ان وضعدار سامعین کی بھی آنکھ بھر آتی۔ ہاں ایک چائے پر باتیں کرتے کرتے مظفر حنفی نے احمد ہمیش سے مؤدبانہ استفسار کیا کہ "ہمیش صاحب۔ یہ جو افسانے میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر آپ پہ رقت طاری ہوتی ہے یہ بے اختیاری ہے یا آپ نے اس کے لئے کوئی مشق



کی ہے"۔

احمد ہمیش نے تامل کیا پھر کہا: "صاحب یہ بے اختیاری ہے۔ ویسے میں ریڈیو آرٹسٹ بھی ہوں"۔

ان اچھے لوگوں میں کیا کیا آدمی رلا ملا نظر آیا۔ علوی برادران جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وارث علوی تو احمد آباد سے چل کر اس لئے آئے کہ انہیں اس سیمینار میں منٹو صاحب پر مقالہ پڑھنا تھا مگر محمد علوی! تم افسانہ نگاروں کی اس بھیڑ بھڑکے میں کیسے چلے آئے۔ آپ سے ملنے۔ یقین کیجئے صرف آپ سے ملنے —— وارث علوی گورے چٹے، بھرا ہوا بدن، محمد علوی، سانولی رنگت، چھریرا بدن۔ خوب کماتے ہیں، خوب بہلتے ہیں، خوب شعر کہتے ہیں۔ دلی آتے ہیں تو اللّے تللّے سے خرچ کرتے ہیں۔ سب کو جلی کٹی سناتے ہیں۔ محمد علوی آپ بھی خوش یار احباب بھی خوش۔ بس باقر مہدی ناخوش۔ محمد علوی کو دھنی رام کہتے ہیں۔ سب کو جلی کٹی سناتے ہیں۔ محمد علوی کو اس وجہ سے کہ وہ یاروں پہ خرچ کرتے ہیں —— بلراج مینرا کو اس باعث کہ وہ "شعور" نکالتے ہیں اور واہ واہ لوٹتے ہیں۔ سب سے ناراض، سب سے خفا۔

سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں سٹیج سے میں نے سامعین کی پچھلی صفوں میں ایک شخص کو تاڑا۔

"قیصر صاحب، آپ؟"

میری گرمجوشی کا جواب انہوں نے برہمی سے دیا: "میں نے سنا ہے کہ تم پرسوں آچکے ہو اور یہیں جامعہ نگر میں ٹھہرے ہوئے ہو"۔

"قیصر صاحب، یہ تو صحیح ہے مگر دوستوں نے اس طرح گھیر لیا کہ . . . . ."

"جی ہاں یہی لوگ آپ کے دوست ہیں۔ میں جامعہ کے اجتماعات میں نہیں آیا کرتا۔ تمہاری خبر سن کر چلا آیا تھا"۔

اور یہ جادہ جا۔

قیصر صاحب جب میرٹھ میں تھے تو ان پر کیسی پھبن تھی۔ جاڑے، گرمی، برسات ایک لباس۔ بادامی کھدر کا کرتا پائجامہ۔ زلفیں دوش کو چھوتی ہوئیں۔ چال ڈھال میں، بات چیت میں، سب سے الگ، سب سے منفرد۔ شہر میں اکیلے نظم آزاد کے شاعر۔ ایک افسانہ بھی لکھا تھا جو منہ زبانی یاد تھا۔ اب بجلی گل کر دو۔ گھپ اندھیرے میں افسانہ سناتے۔ غالب کے پرستار۔ مگر مروجہ دیوان کو کبھی خاطر میں نہیں لائے۔ ہمیشہ نسخۂ حمیدیہ کے شعر سناتے۔ جیسے پورا نسخہ حمیدیہ حفظ ہو۔ انہیں میرٹھ میں دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں ہوا تھا کہ کبھی اس شہر سے نکلیں گے یا کبھی ملازمت اور ازدواجی زندگی کے بکھیڑوں میں پڑیں گے۔ مگر وہ ہماری آنکھوں دیکھتے میرٹھ سے نکلے، جامعہ ملیہ میں معلم بنے، شادی کی، صاحبِ اولاد ہوئے۔ اب ریٹائر ہو کر جامعہ نگر ہی میں جمے بیٹھے ہیں۔ اردگرد چینی کے برتن۔ کوئی ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا، کوئی جارج پنجم کے زمانے کا۔ پرانی خستہ حال کتابیں۔ کسی گمنام فرنگی کا خاندانی البم۔ کسی غیر معروف انگریز کا نسب نامہ۔ بیچ میں قیصر صاحب۔ زلفیں سفید، منہ پہ جھریاں۔ کیا عمارت تھی جسے بڑھاپے نے ڈھا دیا اور وہ شاید وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہوئے۔ پتھر پہلے میرٹھ میں اپنی جگہ بھاری تھا۔ اب دلی میں اپنی جگہ بھاری ہے۔ جب حجامت بنوانی ہوتی ہے تب میرٹھ کا رخ کرتے ہیں۔

"قیصر صاحب۔ سنا ہے کہ آپ حجامت اب بھی میرٹھ ہی جا کر بنوانتے ہیں"۔

"انتظار میاں۔ ہمارے حجام میاں کو تو تم نے دیکھا تھا۔ کتنا صاحبِ ذوق آدمی تھا۔ جس رسالہ کی جب کبھی ضرورت ہوئی، اس کے یہاں سے برآمد ہوا"۔

ویسے بڑھاپا ہمیشہ ایک طرح نہیں آتا۔ جس طرح ہر جوانی دیوانی نہیں ہوتی اسی طرح ہر پیری ضعیفی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مالک رام کو کیا تصور کیا تھا نکلے کیسے۔ تصور کیا تھا کہ اپنی خمیدہ کمر کے ساتھ کسی گوشے میں خستہ بیٹھے ہوں گے اور عینک لگائے مخطوطوں اور مسودوں



پہ جھکے ہوں گے۔ وہاں نقشہ مختلف نظر آیا۔ گیہواں رنگ، چھریرا بدن، بر میں اچکن، سر پہ گاندھی ٹوپی، پائجامہ چھوٹی موری والا، سیدھے چلتے ہیں۔ پھر کی کی طرح پھرتے ہیں۔ ایوانِ غالب میں ہم گئے وہاں موجود۔ غالب انسٹی ٹیوٹ پہنچے وہاں حاضر۔ ساہتیہ اکیڈمی میں براجمان دیکھا۔ انجمن ترقی اردو میں رونق افروز پایا۔ ہر انجمن میں موجود ہیں۔ ہر ادارے میں قدم ہے۔ پنڈت آنند نرائن ملا کو میں نے ۴۸ میں لاہور کے ایک مشاعرے میں دور سے دیکھا تھا۔ اب انجمن ترقی اردو کی تقریب میں کہ خلیق انجم نے ہمارے لئے آراستہ کی تھی، قریب سے دیکھا جیسے تب تھے ویسے ہی کم و بیش اب ہیں۔ بزرگ تب بھی تھے، اب زیادہ نظر آتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور اپنے سفید سر کے ساتھ بزرگوں میں بزرگ، جوانوں میں جوان۔ عناصر میں اعتدال اور قلب میں حرارت برقرار ہے۔ مجھ پہ شفقت کرتے ہیں۔ کشور ناہید کے مداح ہیں۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اس مداحی میں گرمی زبیر رضوی کی طرف زیادہ ہے یا پروفیسر صاحب کی طرف۔ عصمت چغتائی کے آگے افسانے چمکتے تھے اب چاندی بال چمکتے ہیں۔ "لحاف" کے زمانے کی چمک دمک میں نے نہیں دیکھی کہ اس وقت تک تو ہم شروع ہی نہیں ہوئے تھے۔ اب بزرگی میں دیکھا ہے تو ماند تو اب بھی نہیں ہوئی ہیں....!

بڑھاپے کی تباہ کاریاں دیکھنی ہوں تو راجندر سنگھ بیدی کو دیکھو۔ ایسا بڑھاپا آیا کہ ساری عمارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اصل میں یہاں بڑھاپا اکیلا نہیں آیا، بیماری کی کمک ساتھ لے کر آیا۔ آدمی سکھ ہو اور بال سارے سفید ہوں اور ان میں عصمت چغتائی کے چاندی سر والی چمک بھی نہ ہو تو پھر تصور کر لیجیے کہ کیا نقشہ ہو گا۔ عناصر میں اعتدال ختم ہے۔ چلنا پھرنا دشواری سے ہوتا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کی محفلِ افسانہ کو افسانہ سے نوازا بھی تو اس طرح کہ تحریر ان کی، زبانی احمد ہمیش کی۔ افسانہ کیا تھا احمد ہمیش کے ڈرامہ کے ساتھ کیا ہو گیا۔ لاہور کا حال احوال پوچھا پھر افسوس کیا کہ ڈاکٹر نذیر مر گیا۔

میں نے تعجب سے انہیں دیکھا:

"یہ آپ سے کس نے کہا۔ اپنے ڈاکٹر صاحب تو لاہور کی سڑکوں پر دوڑتے پھرتے ہیں"۔

میرے کہے پر انہیں اعتبار نہیں آیا۔ پوچھا۔ "آپ نے کب انہیں دیکھا تھا"۔

"ابھی انہیں دنوں۔ انہیں دنوں انہوں نے مجھے گڑ دے چانپ کھلائے ہیں۔ جتنا میں نے کھایا۔ اس سے زیادہ انہوں نے کھایا۔ کھاتے ہیں، قلانچیں بھرتے ہوئے چلتے ہیں"۔

بیدی صاحب بولے: "اچھا مجھے تو یہی خبر ملی تھی"۔ ۔ ۔ ۔ چپ ہو گئے۔ شاید انہیں میرے کہے پہ ابھی تک اعتبار نہیں آیا تھا۔

اور یہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ میری ان سے پہلی مڈھ بھیڑ کہاں ہوئی تھی۔ ہاں نارنگ صاحب کے یہاں۔ دلی میں میری پہلی شام۔ نارنگ صاحب کے یہاں ادیبوں کا ایک جمگھٹا لگا ہے۔ کتنے ایسے ہیں جنہیں میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ کچھ دیکھے بھالے چہرے بھی ہیں۔ یہ چپٹے چہرے والا ٹھنگنا شخص جو گلاس ہاتھ میں لئے سب سے زیادہ شور مچا رہا ہے خیر یہ تو باقر مہدی ہیں۔ انہیں میں خوب پہچانتا ہوں۔ اور یہ چھریرے بدن والا سرو قد نوجوان۔

"تو آپ ہیں قمر الاحسن"۔

اور یہ گٹھے ہوئے بدن والا پستہ قد نوجوان۔

"میں ہوں آشفتہ چنگیزی۔ آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا"۔

ہاں مجھے یاد آیا۔ اس نوجوان نے مجھے ایک کتاب بھیجی تھی جو ناموں سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے ناموں سے جن سے وہ متاثر ہوا۔ امام حسین سے، ابنِ صفی سے، قرۃ العین حیدر سے، اس ہیچ پوچ سے وغیرہ وغیرہ سے۔ دھمکی کہ اگر آپ نے میرے خط کا جواب نہ دیا تو۔ ۔ ۔ ۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ دھمکی کیا تھی۔

الگ کونے میں بیٹھی ایک عینک پوش خاتون قرۃ العین حیدر سی لگ رہی ہیں۔



"یہ بتائیے آپ واپس جا کر لکھیں گے کیا؟"

واپس جا کر میں کچھ لکھوں گا۔ کیا لکھوں گا۔ یہ تو میں نے ابھی سوچا ہی نہیں ہے۔ مگر قرۃ العین حیدر بھی سچی ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے۔

"آپ کے یہاں سے ایک شاعرہ آئی تھی۔ معاف کیجئے انتظار صاحب۔ وہ تو بہت چھچھوری لڑکی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے وہاں جا کر جھوٹ سچ کیا کیا لکھ ڈالا۔ اور ہاں فہمیدہ ریاض بھی آئی تھیں۔ افسوس کرنے لگیں کہ ادیب کیسی عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ آپ کے پاس کار نہیں ہے۔ تو گویا آپ لوگ ادیب کو اس طرح پرکھتے ہیں"۔

"جناب۔ میں اپنے متعلق تو آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میرے پاس کار نہیں ہے۔ شاید پاکستان کے انقلابی ادیب فہمیدہ ریاض کے پیشِ نظر ہوں گے"۔

"اچھا ٹھیک ہے مگر میں یہ پوچھتی ہوں کہ آپ لوگ ہندوستانی مسلمانوں کو اتنی حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں"۔

باقر مہدی یکایک چلّا اٹھتا ہے۔ کیسا بر وقت چلّایا۔ قرۃ العین حیدر کی توجہ اس طرف ہو جاتی ہے۔

"صاحب۔ یہ شخص بہت شور مچاتا ہے۔ آپ اسے ٹوک سکتی ہیں؟"

"نہیں۔ مجھے اس سے خوف آتا ہے"۔

دلی میں ایک شام، دوسری شام، تیسری شام۔ ہر شام شامِ افسانہ۔ ایوانِ غالب میں سٹیج پر کرسیاں نہیں ہیں مسندیں سجی ہیں۔ ہم مسندِ صدارت پر پھیلے بیٹھے ہیں۔ دائیں ڈاکٹر مالک رام، بائیں پروفیسر آل احمد سرور۔ قرۃ العین حیدر افسانہ سنا رہی ہیں۔ پوری شام پریم چند کو ایک خراج ہے۔ اگلی شام پھر شامِ افسانہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کا شاندار ہال۔ شاندار سٹیج۔ عصمت چغتائی صدر ہیں۔ دائیں بائیں ڈاکٹر مالک رام، پروفیسر آل احمد سرور۔ خشونت سنگھ بیٹھے ہیں۔ خشونت سنگھ جو منیر شیخ کے افسانے پر بے تحاشا داد دے رہے ہیں۔ بلراج مینرا

کا افسانہ، جوگندر پال کا افسانہ، میرا افسانہ، احمد ہمیش، کہانی مجھے لکھتی ہے۔ شہر میں
احمد ہمیش کا پہلا گریہ۔ سامعین کی صفوں سے ایک معمر خاتون کی سسکی کی آواز۔

شام کے بعد رات۔ ڈنر۔ واپسیاں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک کار سو سوار۔ پھر سواری
بھاری۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، شمیم حنفی، میں، میری بیگم عالیہ۔ عصمت چغتائی گھر
کا رستہ بھول گئیں۔

"عصمت آپا، یہ بتائیے کہ مکان کا نمبر کیا ہے؟"

"وہ مجھے معلوم نہیں۔"

"سٹریٹ نمبر؟"

"وہ بھی مجھے معلوم نہیں۔"

"پھر کیا کریں؟"

"آپ چلیں تو سہی۔ میں وہ جگہ پہچان لوں گی۔ ادھر موڑیئے۔ شاید یہ ہے وہ سٹریٹ"۔
بے چارے شمس الرحمٰن فاروقی پاپ بلب پھر گاڑی موڑتے ہیں۔ عصمت چغتائی
سٹریٹ کا جائزہ لیتی ہیں۔

"نہیں۔ یہ وہ جگہ نہیں ہے"۔

ہم پھر شاہراہ پر آ جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی کو پھر ایک سٹریٹ پر شک گزرتا ہے۔
صاحب سٹریٹ تو ویسی ہی ہے مگر مکان کوئی ویسا نظر نہیں آیا۔ مکان ویسا نظر آتا ہے تو
سٹریٹ ویسی نظر نہیں آتی۔ جرنیدہ یا بندہ۔ آخر ایک کوٹھی کو تاڑتی ہیں۔

"بس یہاں اتار دیجیے"۔

"دیکھ لیجیے وہی جگہ ہے"۔

"بس بس مجھے اتار دیجیے"۔

ایک رات ڈرائیور رستہ بھول جاتا ہے۔ باقی لوگ رستے میں اپنے اپنے ٹھکانے پر اتر



گئے ہیں۔ میں جھانک کر دیکھتا ہوں اور پھر قرۃ العین حیدر سے کہتا ہوں کہ اس سڑک پر اندھیرا
بہت ہے اور پانی نظر آ رہا ہے۔ ہم کسی اور رستے پر تو نہیں پڑ گئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر ڈرائیور سے پوچھتی ہیں: "ڈرائیور تم ٹھیک جا رہے ہو؟"

ڈرائیور چونکتا ہے: "صاحب چوک ہو گئی۔ یہ تو ہم جمنا کی طرف آ گئے"۔

میں کتنا خوش ہوتا ہوں۔ دلی کی یہ رات، یہ ہوا، یہ جمنا کا کنارہ۔

خدا خدا کر کے ایک شام خالی میسر آئی ہے۔ بسیرا کے ہرے بھرے مختصر سے سبزہ زار میں
بیدِ لرزاں کے سائے میں بیٹھا ہوں۔ ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ لمبا قد، سانولا رنگ، چوڑے
چوڑے نقش، بر میں گیروے کھدر کا کرتا۔ ویسا ہی پاجامہ چوڑے پائنچوں والا۔ پیروں میں
چپل۔ علیک سلیک ہوتی ہے۔ پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ کون صاحب ہو سکتے ہیں۔
یکایک خیال آتا ہے، شمیم حنفی نے کہا تھا کہ آج شام راما چندرن تم سے ملنے آ رہے ہیں۔
اچھا تو یہ راما چندرن ہیں۔ انہیں دیکھا۔ پھر ان کی تصویریں دیکھیں، خاص طور پہ بندروں والی۔
بندروں کو کیا خوب جانا اور سمجھا ہے۔ ایک بوڑھا مداری اور ایک بوڑھا بندر بغیر رسی کے۔ پاس
پاس بیٹھے ہوئے جیسے پرانے رفیق ہوں۔ مداری کی شکل بندر سے ملتی جلتی ہے۔ بندر کی صورت
میں مداری کی شباہت ہے۔ تو من شدی من تو شدم۔ راما چندرن کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسی
جوڑی دیکھی ہے۔ مداری نے بڑھاپے میں اپنے بندر کو آزاد کر دیا۔ مگر بندر بھی بوڑھا ہو چکا تھا۔
اس بڑھاپے میں ہمدمِ دیرینہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ بس اس کے پاس بیٹھا رہتا۔

راما چندرن جنوبی ہند کے باسی ہیں۔ آزاد منش، خلوت پسند۔ کم ملنا، کم بات کرنا۔ باتونی
میں بھی نہیں۔ پھر ان کی زبان ملیالم۔ اپنا محاورہ اردو میں۔ سو ملاقات، زیادہ ہوئی باتیں کم
ہوئیں۔ ان کی لائبریری میں گیتا گوبندا کو نمایاں دیکھ کر میں نے کہا:

"دیکھیے یہ نظم ہم نے انگریزی ترجمہ میں پڑھی تھی مگر نرد چودھری سے پتہ چلا کہ آرنلڈ نے
امانت میں خیانت کی ہے۔ مقاماتِ وصل بربنائے کثافت حذف کر دیے ہیں"۔

"اصلی گیت گووند بکھنی ہے"...... کہتے کہتے انہوں نے ایک مرقع نکالا اور کھول کر سامنے رکھ دیا۔ حجابات غائب۔ غیراز نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا۔

پھر انہوں نے گیت گووند گانی شروع کر دی۔ سنسکرت کے بول میں کیا سمجھوں۔ مگر پھر بھی مجھے کچھ ہوتا جا رہا تھا۔ شاعری اپنا اثر کرتی ہے، بیشک سمجھ میں نہ آئے۔

دلی نے احمد ہمیش میں خوشی بھر دی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو بیمار ڈال دیا۔ جنپت سے بلراج کومل کے یہاں منتقل ہوئے کہ شاید دوست کے گھر میں راحت میسر آئے اور سنبھل جائیں مگر نہیں۔ ان کے لئے اب کھڑا ہونا اور بیٹھنا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ تو انہوں نے لاہور کا رخ کیا۔ ہمارا رُخ علی گڑھ کی طرف تھا۔ وہاں پریم چند سیمینار کا اہتمام تھا۔ ڈاکٹر ثریا حسین مہتمم۔ پورا قافلہ دلی سے علی گڑھ کی سمت۔ ہم چلے، ہمارے ساتھ منیر شیخ چلے، لنڈا چلیں، بلراج مینرا چلے۔ قافلہ سالار بن کر نارنگ صاحب چلے۔

یہ زمین، یہ درخت، یہ لوگ، جیسے انہیں کبھی دیکھا ہو، کونسا سٹیشن ہے یہ؟ خورجہ! اچھا خورجہ ہے۔ تو یہ تو اپنا ضلع ہے۔ بلند شہر ضلع کی زمین۔ علی گڑھ آیا سمجھو۔ بس آ گیا۔ میں نے کیمپس میں قدم رکھا اور جانا کہ علی گڑھ کا رنگ گلابی ہے۔ ہیں بھی تو یہ بہار کے دن۔ اپریل ابھی لگا ہے مگر کتنے پھول اور اتنا رنگ علی گڑھ تو مہک رہا ہے یا شاید ماضی کی خوشبو نے شامل ہو کر اسے میرے لئے زیادہ مہکا دیا ہے۔

"دیکھئے ہمارا خیال یہ ہے کہ سیمینار جاری ہے آپ پہلے سیدھے وہاں چلیں"۔

"نہیں جناب" میں نے گزارش کی۔ "علی گڑھ آئے ہیں تو پہلے سرسید کو سلام کرنا ضرور ہے"۔

"ٹھیک ہے۔ پہلے سرسیّد کے مزار پر چل کر فاتحہ پڑھ لیجئے"۔

دائیں بائیں محسن الملک اور سر راس مسعود۔ بیچ میں سرسیّد احمد خاں۔ یہ یونیورسٹی کی مسجد کا صحن ہے۔ پورا صحن اس وقت دھوپ سے بھرا ہے۔ ایک گوشے میں چھاؤں ہے بس وہیں



دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہوں۔ دور سے کوئل مستقل پکار رہی ہے مگر میرا دھیان اس وقت دوسری طرف ہے۔ نظر سرسیّد کے مزار سے چل کر مسجد کے در و بام پر جاتی ہے میناروں اور گنبدوں پہ۔ ایک گنبد پہ جا کر ٹک جاتی ہے۔

"سب گنبد اور مینار درست حالت میں ہیں مگر وہ جو گنبد ہے نا۔ اس کا ایک کونہ جھڑا ہوا ہے"۔

"جی۔ بات یہ ہے کہ مسجد کے عقب میں کرکٹ فیلڈ ہے۔ ایک مرتبہ مولانا شوکت علی نے کھیلتے کھیلتے چھکا مارا۔ گیند اس گنبد سے ٹکرائی۔ کونہ جھڑ گیا۔ اس چھکے کی یاد میں گنبد کا یہ کونہ اسی طرح چلا آتا ہے"۔

علی گڑھ شہر میرے لئے نیا نہیں مگر یونیورسٹی کو میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ ان گئے دنوں میں کبھی علی گڑھ آنے پر اس طرف آنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ شاید جدائی اور دُوری نے میرے لئے اس میں معنی پیدا کر دیئے ہیں اور جادو بھر دیا ہے۔ اُن دنوں یہ ایک درس گاہ تھی۔ میری درسگاہ سے الگ۔ اب وہ میرے لئے ایک تاریخ ہے۔ اب یہ بات میرے لئے معنی نہیں رکھتی کہ میں یہاں کا پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ میں اس درسگاہ کا فرزند نہیں۔ مگر اس تاریخ کا بچہ ہوں۔ مجھے تھوڑا عجیب لگ رہا ہے کہ دلّی سے قریب ہونے کے باوجود میں میرٹھ نہیں جا سکا ہوں مگر علی گڑھ نے مجھے کھینچ بلایا ہے۔ ایک بلاوا ثریا حسین کی طرف سے، ایک بلاوا سرسید احمد خان کی طرف سے۔ میں کھنچا چلا آیا ہوں۔ اس وقت مجھے وہ سب باتیں جو میں نے سرسید احمد خان کے خلاف کہی اور لکھی ہیں لایعنی نظر آ رہی ہیں۔ اپنی باتیں بھی، اپنے ہم عصروں کی باتیں بھی۔ سلیم احمد اور سجاد باقر رضوی اس وقت مجھے کتنے احمق لگ رہے ہیں۔ میں ان سبزہ زاروں کو، ان دیواروں اور دروں کو، ان برآمدوں کو، ان ایوانوں کو اپنی نظروں سے سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کچھ بچنا نہیں چاہئے سب کچھ میری آنکھوں میں سمٹ آنا چاہیئے۔ یہ سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہال۔ اور محفل

پاکستانی مندوب ہونے کے ناطے یہاں پریم چند سیمینار کی ایک نشست کی صدارت مجھے بسترآگئی ہے۔ اس کے بعد بھی ہال، بھی مجمع، مگر تعداد میں زیادہ اتنا کہ دروازوں میں بھی لوگ ٹھنسے کھڑے ہیں۔ میں مختصر محفلوں میں اپنا افسانہ سنانے کا عادی ہوں۔ یکایک ان کھچاکھچ سامعین کے روبرد آن کھڑا ہوا ہوں۔ "شہرِ افسوس" شروع کرتے کرتے ایک لمحہ کیلئے مجھے خیال آتا ہے کہ علی گڑھ اپنی ہوٹنگ کیلئے مشہور چلا آتا ہے۔ مگر پڑھتے ہوئے مجھے ان پر اور اپنے لفظوں پہ اعتبار آتا چلا جاتا ہے۔ شاید یہ میرا افسانہ پہلے اتنا بامعنی نہیں تھا۔ اس نے پورے معنی اب یہاں آکر پائے ہیں۔ ان سامعین نے جیسے اس افسانے کو ایک نئی طاقت دیدی ہو۔

اب صبح ہورہی ہے۔ منہ اندھیرے کوئل نے مجھے پکارا ہے اور میں اٹھ بیٹھا ہوں، پھر مجھے رفتہ رفتہ احساس ہوتا ہے کہ باہر بہت شور مچ رہا ہے۔ مجھے باہر بلایا جارہا ہے۔ یہ وائس چانسلرز ہاؤس ہے۔ رفقا یہاں سے فاصلہ پہ قیام پذیر ہیں۔ یہاں میں ہوں۔ عالیہ ہیں۔ انہیں سوتا چھوڑ کر میں باہر نکلتا ہوں۔ دیکھنا تو چاہئے کون مجھے بلارہا ہے۔ سبزہ زار میں کھڑا ہوا وہ اونچا سرخ درخت۔ اس پر طوطوں اور فاختاؤں کی پوری برات۔ اچھا یہ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ کتنے خوش ہیں۔ کتنا شور مچا رہے ہیں مگر کوئل آس پاس نہیں ہے کہیں دور سے پکار رہی ہے۔ شاید علی گڑھ سے بھی پرے۔ شاید علی گڑھ سے پرے جو میرا نگر ہے وہاں کسی طرح میرے آنے کی خبر پہنچ گئی ہے۔ کیا یہ پکار وہاں سے آرہی ہے۔ مگر میں تو پہلے ہی سے وہاں جانے کے لئے مستعد ہوں۔ وائس چانسلر شفیع صاحب کتنے اچھے آدمی ہیں ___ ثریا حسین نے کہا اور انہوں نے اپنی ایک موٹر میرے حوالے کردی۔

علی گڑھ کے گلابی رستے اس نرم ٹھنڈی صبح میں زیادہ گلابی دکھائی پڑ رہے ہیں۔ مگر مجھے اس وقت انہیں دیکھنے کا دماغ نہیں ہے۔ کوئل کی پکار میں بے تابی بڑھتی جارہی ہے۔ ادھر میں بے تاب ہوں۔ میں چشم زدن میں وہاں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ علی گڑھ سے نکل کر گاڑی



اس سڑک پر آگئی ہے جو سیدھی ڈبائی جاتی ہے۔

چلتے ہوئے یونہی مجھے دانپور کا خیال آتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی سے کہتا ہوں کہ ڈبائی کے قریب ہی ایک گاؤں ہے دانپور۔ میرا کچھ وہاں سے بھی رشتہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ وہاں بھی جاؤں۔

اچانک ایک موڑ دکھائی دیتا ہے۔ کسی بستی کا موڑ۔ ہندی میں ایک سائن بورڈ نصب ہے۔ دانپور..... ارے دانپور تو اسی سڑک پہ ہے۔ کیوں نہ گاڑی کو ابھی اسی طرف مڑوا لیا جائے اور وہ بڑا کچا گھر میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس کے عقب میں املی کا پیڑ اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی ساری چھاؤں اور ساری گٹاریں اس گھر کی چھت کی ملکیت تھیں۔ انگنائی میں کھڑا نیم۔ اس کے سائے میں پلنگ پہ بیٹھے ہوئے ہمارے ایک دادا میاں کہ اپنے بھاری جثے، سفید داڑھی اور ترکی ٹوپی کے ساتھ بالکل علامہ راشد الخیری لگتے تھے۔

میں سوچتا رہ جاتا ہوں۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ ڈولتے ہوئے اکے، کوئی کوئی بیل گاڑی، مانوس بولیاں، لوگ کچھ اجنبی سے، کچھ جانے پہچانے سے۔ یہ تو ڈبائی آگئی۔ ہاں ڈبائی۔ مگر اندر جانے کا رستہ کہاں ہے۔ میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ اندر جانے کا رستہ نہیں مل رہا۔ ٹھیک ہے۔ میں اس بستی سے نکل چکا ہوں۔ اب یہ بستی مجھے اندر آنے کے لئے رستہ نہیں دے گی۔ اب تو میں خواب ہی کے ذریعے یہاں آسکتا ہوں۔ مگر خواب میں بھی کتنی بار رستہ بھولا ہوں۔

"چلو ابوالکلام قاسمی، واپس چلتے ہیں"۔

"مگر کیوں"۔ ابوالکلام قاسمی میرا منہ تکنے لگتے ہیں۔ "رستہ تو ہم نے پوچھ لیا ہے"۔

"نہیں یوں نہیں۔ ہم پوچھیں اور کوئی بتلائے۔ یوں کون جائے"۔

میں واپس آگیا ہوں۔ سیمینار جاری ہے۔ سب پوچھ رہے ہیں، اپنی ڈبائی ہو آئے۔ میں سٹپٹایا ہوا ہوں۔ جواب بن نہیں پڑ رہا۔

شام کو مجلس اردوئے معلّٰی کے استقبالیے میں گئے۔ صدر اس مجلس کے ڈاکٹر مسعود حسین خاں ہیں۔ وہاں سے بھاگم بھاگ سٹوڈنٹس یونین کے استقبالیہ میں۔ ارے صاحب انہوں نے تو ہمیں پھولوں سے نہلا دیا۔ گلے میں اتنے گجرے کبھی کاہے کو پڑے تھے اور پھر اوپر سے پتیوں کی بارش۔ احمد ہمیش نے اچھا کہا کہ اب اس کے بعد میرے لئے مرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ مگر ابھی تو اسے الف لیلیٰ کا ابوالحسن بننا تھا۔ عبداللہ ہال لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر لڑکی کے پاس ایک عدد آٹو گراف بک تھی۔ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے بھی شل ہوئے۔ مگر آٹو گراف بکس بھی ہمارے قلم سے بہت رنگی گئیں۔ ثریا حسین نہ بچاتیں تو رات بس اسی میں گزر جاتی اور ہم بھرے ہی واپس آتے۔

دوپہر کو میں ایجوکیشنل بک ہاؤس گیا۔ رات کو انہوں نے مجھے آ پکڑا۔ جب عبداللہ ہال کے ڈنر سے نبٹ کر اور ثریا حسین کے گھر اناس پی کر رات گئے میں نارنگ صاحب کے ساتھ واپس ہو رہا تھا تو احساس ہوا کہ کوئی سکوٹر ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ یا اللہ — علی گڑھ میں آ کر یہ افتاد پڑی۔ وائس چانسلرز ہاؤس میں پہنچ کر گاڑی رکی۔ کھٹ سے پیچھے ایک سکوٹر رکا ارے یہ تو نا لفاظ والے ہیں اور ابوالکلام قاسمی۔ آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر۔ اس وقت ان سے افسانوں کا ایک معاملہ ہوا۔

صبح صبح رخصت تھی۔ آج میں خود جاگا اور خود نکل کر باہر آیا۔ مرغ بیر پر طوطے، کوّے، بلبلیں، فاختائیں سب موجود تھیں مگر سب چپ تھیں۔ بیچ بیچ میں کوئی طوطا بولا مگر پھر چپ ہو گیا۔ رخصتی خاموشی میں ہوئی۔ موٹر جب دور نکل گئی تب کہیں بہت پیچھے سے کوئل کی دکھ بھری آواز آئی۔ مگر اب علی گڑھ پیچھے کھسکتا جا رہا تھا۔ میرا منہ دلّی کی طرف تھا۔

ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے سوچا کہ ریوتی کو دفتر میں فون کروں کہ دفتر چھوڑو اور موٹر لیکر آ جاؤ۔ پھر سوچا کہ اسے اس وقت دفتر سے کیوں اکھاڑا جائے۔ شمس الرحمٰن فاروقی سے گزارش کرتے ہیں۔ وہ وضعدار شخص فوراً اپنے ڈرائیور کو بھیجے گا۔ مگر ایک دم سے مجھے موٹر کا خیال باطل نظر آیا۔ اپنے آپ پر نفرین کی کہ اے کم نصیب! تو لاہور سے یہ بیڑا اٹھا کر چلا تھا کہ آ کے جا کر دلّی کی گلیوں کی خاک چھاننی ہے۔ یہاں آ کر تو موٹروں کے موہ میں پھنس گیا۔ شاہجہان کی دلّی کو تو نے کیا جانا ہے۔ اس کی گلیوں نے کبھی کسی موٹر سوار کو درشن دیئے ہیں۔ ویسے کوئی بھی بستی ہو اس کی جڑیں اگر کارخانے میں نہیں زمین میں ہیں تو وہ موٹر سواروں کو تو اپنا آپا نہیں دکھلائے گی۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ میں تیر کے موافق ڈیوڑھی سے نکلا اور زن سے سڑک پر سٹ پٹ کرتا چلا جاتا تھا کہ ایک ٹیکسی قریب سے گزری۔ مجھے دیکھ کر اس نے رفتار بھی سست کر لی۔ میں نے بھی سوچا کہ پیادہ پائی پرانی دلی کے لئے خوب ہے۔ نئی دلی کی شفاف سڑکیں گھومتے دوڑتے پہیوں کو جانتی ہیں، پیادہ پائی کی روایت سے ناآشنا ہیں۔ بس یہ سوچ کر ٹیکسی میں بیٹھ لیا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے تدبّر کیا کہ ایک دن مہمان، دو دن مہمان، تیسرے دن بلائے جان۔ تم نے پاکستانی مندوب بن کر خوب مدارات کرائی۔ استقبالیے لئے۔ ڈنر کھائے۔ دعوتیں اڑائیں۔ شمع والوں کا ڈنر واہ واہ۔ ایوانِ غالب کا زردہ پلاؤ سبحان اللہ۔ گلزار دہلوی تشنی صاحب نے بھی اپنی انجمن میں تمہیں نوازا۔ اپنی کم حیثیتی کے باوصف تم نے نیّر رحمٰن سے بھی ایک استقبالیہ لیا۔ اب تمہیں اور کیا چاہیئے۔ اب تم دلی میں جتنے دن رہنا چاہتے ہو آدمی بن کر رہو۔ شہر کو ٹک دیکھو۔ دلشاد کرو اور چل نکلو۔ کچھ خاک چھانو کچھ خاک پھانکو۔ کچھ ٹانگوں کو تھکاؤ۔ کچھ پسینہ میں بھیگو۔

پولیس کے دفتر میں جا کر آمد کا اندراج کرایا۔ نکل کر سکوٹر رکشہ لی اور مارا مار کرتا ہوا جامعہ نگر پہنچا۔ نیرا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شمیم حنفی کو گرفتار کیا۔ چلو چلتے ہیں۔ کہاں۔ منیرا کو دیکھیں گے۔ پھر دلی دیکھیں گے۔ مگر محمود ہاشمی جو آنے والے ہیں۔ آتے ہیں تو آنے دو۔ سمجھو کہ وہ بھی پکڑے گئے۔ شمیم حنفی کی بیٹیوں سیمیں اور غزل سے ان کی تلّی کی خیریت پوچھی۔ تھوڑا کھایا پیا۔ محمود ہاشمی آ چکے تھے۔ نکل کھڑے ہوئے۔ آج بس میں سفر کیا۔ دریا گنج پہنچ کر پیدل ہو لئے۔ پہلے بیسویں صدی کے دفتر میں رحمٰن نیّر کے پاس۔ پھر منیرا کی طرف۔

شمیم حنفی نے ایک بوسیدہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سرسید احمد خان کا مکان ہے"۔

گزر کر وہاں پہنچے جہاں "شعور" کا دفتر تھا مگر دفتر مقفل تھا۔ آؤ چلو کمار پاشی کو جھانک لیں۔ وہ بھی تو یہیں رہتا ہے۔ پتلی گلی جیسے کانی انگلی۔ مگر وہ بھی گھر سے غائب تھا۔ اب کیا کریں۔ میں نے کہا کہ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تھوڑی دیر کوچہ گردی ہی سہی۔ تھوڑا ان گلی کوچوں کو چھانیں۔ پھر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چل کر بیٹھیں۔

محمود ہاشمی اور شمیم حنفی بتلاتے جاتے ہیں۔ یہ مفتی صدر الدین کی حویلی ہے۔ یہ ہے نواب شیفتہ کی حویلی۔ میں حیران کہ جو کبھی واقعی حویلیاں ہوں گی اب ان کا کیا ابتر نقشہ ہے۔ یہ چتلی قبر ہے اور اب ہم کوچہ چیلاں میں ہیں۔ کوچہ چیلاں۔ اچھا۔ یہاں تو اب بھی وہی نقشہ ہے۔ اس قدر آباد نہ سہی پھر بھی بہت آباد ہے۔ اب بھی یہاں کندھے سے کندھا چھلتا ہے وہی چال ڈھال۔ وہی بولی ٹھولی۔

جامع مسجد۔ نمازی اسی طرح چڑھتے اترتے ہوئے۔ ہاں جن سیڑھیوں پہ کبھی بازار آباد تھا وہ اب صاف ہیں۔ بازار سیڑھیوں سے اتر کر زمین دوز نئی دکانوں میں جا بسا ہے۔ سیڑھیوں کے برابر ایک ہاتھی کھڑا ہے جس پر ایک بڑا سا اشتہار جھول رہا ہے۔ لکھنؤ کے کڑھے ہوئے کرتے ہم سے خریدیئے۔ اے زمانے تیرا برا ہو۔ تو نے بیچ دلی میں لال قلعہ کے روبرو ہاتھی کو گرا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ باقی رہا اس بازار کا معاملہ تو مت پوچھو کہ دلی کے روایتی بازاروں نے مجھے کتنا مایوس کیا۔ میں شمیم حنفی کو رہنما بنا کر بازار بازار پھرا۔ جامع مسجد کے بازار سے چاندنی چوک۔ پورا چاندنی چوک چھان مارا۔ پھر بلیماروں کی گلی کو چھانا۔ بو والا لیمپ کہیں نہیں ملا۔ تب میں نے جانا کہ ہر عہد اپنی جوتیاں ساتھ لاتا ہے اور ہر عہد جاتے ہوئے اپنی جوتیاں ساتھ لے جاتا ہے۔ پھر میں نے اس شہر میں شیروانی پہننے کا ارادہ ترک کیا اور پتلون بشرٹ کے ساتھ گزارا کیا۔



محمود ہاشمی نے کہا کہ اچھا اب یہاں سے چاندنی چوک چلتے ہیں۔ وہاں میں آپکو ایک ایسی دکان سے جلیبیاں کھلاؤں گا جو سو سال پرانی ہے۔ مگر اب ہم پیدل نہیں چلیں گے۔ سائیکل رکشہ کئے لیتے ہیں۔

سو سال پرانی جلیبیوں کی دکان یعنی اس وقت کی جب ابھی چاندنی چوک کے بیچوں بیچ نہر چلتی تھی۔ نہر کے برابر آم جامن کے درخت، سواری کے نام فٹن، بگھیاں۔ پھر نہر پٹ گئی۔ درخت کٹ گئے۔ بگھی غائب ہو گئی۔ نیا زمانہ نئی سواریاں۔ ٹرام کی پٹریاں بچھائی گئیں۔ ایک دائیں ایک بائیں۔ اس کے باوجود یہ سڑک کتنی چوڑی نظر آتی تھی۔ اب یہ پٹریاں غائب ہیں پھر بھی سڑک تنگ نظر آتی ہے۔ سڑک پر ٹریفک کا ہجوم ہے۔ فٹ پاتھ پر خریداروں کا ہجوم۔ میں ہجوم کے درمیان پھنسا کھڑا ہوں اور جلیبیاں کھا رہا ہوں۔ محمود ہاشمی مجھے بار بار یہ کہہ کر ان جلیبیوں کا قائل کر رہے ہیں کہ یہ دکان سو سال سے قائم چلی آتی ہے اور مجھے اپنے ہاپوڑ کا وہ حلوائی یاد آ رہا ہے جس کا جلیبا اس جلیبی سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتا تھا۔ مگر اس جلیبی میں تاریخ کا ذائقہ بھی تو شامل ہو گیا ہے۔ تاریخ کے ذائقہ کا میں خود بہت قائل ہوں مگر جلیبیوں کے معاملہ میں نہیں۔ جلیبی کو اولاً جلیبی ہونا چاہیئے۔ اس کی تاریخی حیثیت ہو یا نہ ہو۔

محمود ہاشمی نے برابر کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ عمارت نادر شاہ کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ یہیں بیٹھ کر اس نے قتلِ عام کا حکم دیا تھا"۔

میں زمانے کے الٹ پھیر پہ حیران ہوں۔ یہاں اس برابر والے کوٹھے پر بیٹھ کر نادر شاہ نے قتلِ عام کا حکم دیا تھا اور عین اس عمارت کے سائے میں میں اس وقت جلیبیاں کھا رہا ہوں۔ سو سال پرانی جلیبیاں چاندنی چوک کی خود ایک تاریخ ہے۔ وہ اپنی جلیبیوں سے زیادہ قدیم ہے۔ شاید اسی لئے میں ہر پھر کر اس بازار میں آتا ہوں۔ مگر جب ریوتی کے ساتھ آتا ہوں تو مقصود تاریخ کا ذائقہ نہیں ہوتا، عالیہ کو خریداری کرانی ہوتی ہے۔ ریوتی کو بھاؤ تاؤ کرنے میں کمال حاصل ہے۔ دیر تک بھاؤ تاؤ کیا پھر کہا کہ آگے کی دکان پر سستی ملے گی اور آگے کی دکان

پر پھر وہی عمل۔ بھاؤ تاؤ زیادہ خریداری برائے نام۔ اور میں یوں ان بازاروں میں گھنٹوں پیدل چل سکتا ہوں مگر جب مقصود خریداری ہو تو میں چار قدم چلتا ہوں اور تھک جاتا ہوں اور اب ہم چلتے چلتے دکانوں کو جھانکتے جھانکتے نئی سڑک پر آنکلے ہیں۔ عالیہ اور ریوتی مل کر بنارسی ساڑھی کا بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ اس کاروبار میں انہیں بہت جھک جھک کرنی ہے میں آہستہ سے دکان سے نکلتا ہوں اور نئی سڑک کو قدموں سے ناپتا ہوں۔ یہ وہی سڑک ہے جہاں ریوتی کے جیجا کی بیٹھک تھی۔ یہاں میں کتنی مرتبہ آیا ہوں اور ٹھہرا ہوں۔ میں گھوم پھر کر اس عمارت کو شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ زینہ، وہ چوبارہ، ان میں سے کونسی عمارت ہو سکتی ہے وہ۔ شام کا وقت ہے۔ دو لڑکیاں آتی ہیں۔ ایک لڑکی چھریرا بدن، سانولی رنگت سوتی ساڑھی۔

"انتظار، یہ سرلا دیوی ہیں"۔

لڑکی دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتی ہے۔ دوسری لڑکی اس کی سہیلی ہے۔ نرملا۔ گوری رنگت، چھلکتا بدن۔

"سرلا کو دیکھا۔ کیسی لڑکی ہے"۔

"بہت اچھی ہے۔ سادگی بہت ہے۔ بہت شریف لگتی ہے۔ اور پھر کرشن چندر کی بہن ہے"۔

سرلا کائستھ گھرانے کی بیٹی تھی۔ برہمن کے گھر آ کر اسے گوشت سے پرہیز کرنا پڑا۔ اب بیٹے ماں کے نقصان کی تلافی کر رہے ہیں۔ گھر میں گوشت نہیں پک سکتا مگر باہر جا کر کھایا جا سکتا ہے۔ اشوک ہوٹل میں چار فرد انہماک سے گوشت خوری میں مصروف ہیں۔ بینو، اس کی بیگم ڈمپو، میں، عالیہ۔ پانچواں فرد ریوتی ہے کہ بھاجی ترکاری پر جھکا ہوا ہے۔

بس دلی میں ابھی چلنا پھرنا شروع کیا تھا کہ کھنڈت پڑ گئی۔ نارنگ صاحب نے اطلاع دی کہ بمبئی چلنا ہے۔



"نارنگ صاحب۔ بمبئی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں ہے۔ میں ہندوستان میں نئے شہروں کی سیر کرنے کے لئے نہیں آیا ہوں"۔

"مگر انتظار صاحب۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے آپکو مدعو کیا ہے"۔

"اچھا نارنگ صاحب۔ پھر ایک شرط ہے۔ اجنتا ایلورا کے سفر کی صورت نکالئے۔ پھر بمبئی کے سفر میں میرے لئے معنی پیدا ہو سکتے ہیں"۔

"چلئے آپکو اجنتا ایلورا بھی دکھا دیں گے۔ اسے آپ اپنا نجی سفر سمجھ لیجئے۔ واپسی ریل گاڑی سے کیجئے"۔

بمبئی کو نیا شہر کس نے کہا۔ مجھے تو وہ انسانی تہذیب سے پہلے کا شہر نظر آیا۔ آدمی نے غاروں سے نکل کر بستیاں بسائیں۔ شہر آباد کئے۔ حویلیاں تعمیر کیں۔ بمبئی پہنچ کر وہ واپس غاروں میں چلا گیا۔ بمبئی غاروں کا شہر ہے۔ غار نئی طرز کے ہیں۔ انہیں فلیٹ کہا جاتا ہے۔ سارا شہر فلک بوس غاروں سے پٹا پڑا ہے اور آدم لوگ سے لبالب بھرا ہے۔ غار ہی غار۔ لوگ ہی لوگ۔ غاروں سے نکلتے ہوئے، غاروں میں داخل ہوتے ہوئے۔ مجھے اس شہر سے بہت خوف آیا۔ قدم قدم پہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں ساتھیوں سے بچھڑ نہ جاؤں۔ بچھڑا اور کھویا۔

اسی شہرِ ناپُرساں میں اچھے لوگ بھی ملے۔ اور کتنے اچھے۔ مہابردت جنھوں نے ہمیں ہمارے میزبانوں سے بے نیاز کر دیا۔ ہر وقت موجود، ہر وقت سنگ ——— گرلش چندر گورا چٹا، بے ترتیب سی داڑھی، ملا دلا لباس، پیروں میں چپل۔ لہجہ گجراتی۔ باتیں اردو افسانے کی۔ اس کے طفیل فلیٹوں کے اس شہر میں ایک سچ مچ کا گھر دیکھا۔ روایتی طرز کا بنا ہوا مکان۔ اپنے طرز کی حویلی۔ پتہ چلا کہ یہ گجرات کا ایک کاروباری گھرانا ہے۔ جدی پشتی امیر ہیں۔ اپنی زبان گجراتی ہے۔ اردو افسانے سے دلچسپی ہے ——— کملیشور، چھوٹا قد، بھرا بھرا بدن، سانولی رنگت۔ کیا باغ و بہار آدمی نکلے۔ افسانے ہندی میں لکھتے ہیں۔ باتیں شستہ اردو میں کر رہے تھے۔ کریدا تو بتلانے لگے کہ ہمارے گھرانے کی روایت فارسی اور اردو کی ہے،

والدصاحب انہیں زبانوں میں رواں تھے۔ میں ان سے ٹوٹ گیا۔ اپنا منصوبہ بتایا کہ دنیا کے افسانوں کا انتخاب بجلد در جلد کر رہا ہوں۔ ایک جلد اردو افسانے کی ہوگی۔ پھر اپنے ہم عصر اور دوست ایک ہندی شاعر کی غزلیں سنانے لگے۔ غزلیں سیدھی سادی اردو میں تھیں۔ مگر لکھی ہوئی تو ہندی میں تھیں اور بحروں میں کچھ ہندی بحروں کی آمیزش تھی۔ سو وہ ہندی غزل ٹھہری۔ یہ ہندی غزل گو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

کملیشور رخصت کرنے لگے پیروں اپنے فلیٹ سے نکلے۔ زینہ اترے۔ کار میں ہمیں بٹھایا اور علی سردار جعفری کے دروازے پر چھوڑ کر واپس ہوئے۔ علی سردار جعفری ان دنوں بیمار تھے۔

"انتظار صاحب۔ آپکو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے آپ کے چند افسانے پسند آئے ہیں اور 'کشتی' کو میں نے اپنے انتخاب میں شامل کیا ہے۔"

حیرت سی حیرت ـــــ پھر اس شور مچانے والے شخص باقر مہدی کی عیادت کو گئے کہ سیمینار میں شور مچاتے مچاتے بستر پر پڑ گیا اور یرقان میں مبتلا ہو گیا۔

خواجہ احمد عباس اور مجروح سلطانپوری سے تقریب میں ملاقات ہوئی۔ اور ہاں..... سلمیٰ صدیقی سے۔ چھریرا بدن، پتلے پتلے نقش، گوری رنگت، شربتی آنکھیں۔ کیا عمارت ہوگی جسے غم نے ڈھایا ہے۔ کچھ کرشن چندر کے غم نے، کچھ عمر نے۔ اصل میں بمبئی میں قدم رکھتے ہی مجھے کرشن چندر کی یاد آنے لگی تھی جیسے طالب علمی کے زمانے والی مداحی عود کر رہی ہو۔ سوچا تھا کہ اس گھر جا کر سلمیٰ صدیقی کو سلام کروں گا۔ مگر وہ تقریب میں آئی بیٹھی تھیں۔ اور ہاں ندا فاضلی۔ کسی نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ:

"انتظار حسین کا نام آپ نے سنا ہوگا۔"

بولے: "نہیں۔ میں نے تو نہیں سنا" ـــــ بعد میں کُھلے۔ بولے۔ "میں نے اپنے والد دعا ڈبائیوی سے آپکا ذکر سنا تھا۔ آپ میری بات کا بُرا تو نہیں مانے۔"



میں نے کہا: "ہرگز نہیں۔ اگر تم یہ بات نہ کرتے تو تمہارا ڈبائی والا ہونا کیسے ثابت ہوتا۔"

تقریب میں ایسے کتنے عزیز ملے جو ناراضگی کے لہجہ میں کہہ رہے تھے کہ دعوت نامہ تو ہمیں نہیں ملا۔ آپ کا سن کر چلے آئے ہیں۔ اور نوجوان افسانہ نگاروں کا قافلہ تو شمشیر بکف آیا تھا۔ ادھر تقریب شروع ہوئی ادھر مہمانوں نے مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے کرتا دھرتا غفور صاحب کے خلاف پمفلٹ تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ ان نوجوان افسانہ نگاروں کے گرو ہیں سریندر پرکاش ـــ مگر چیلے گرو سے بگڑ گئے۔ ٹھہری یہ تھی کہ سریندر پرکاش کے گھر یہ افسانہ نگار ہمارے ساتھ مل کر بیٹھیں گے اور پھر باتیں ہوں گی۔ مگر سریندر پرکاش نے ہماری خاطر اکیڈمی کی تقریب میں افسانہ پڑھ دیا۔ بس نوجوان بگڑ گئے۔ اور پھر ہمیں افسانہ نگاروں کے نام خالی سریندر پرکاش پر گزارہ کرنا پڑا۔

بلراج مینرا اور سریندر پرکاش ہندوستان میں نئے افسانے کے انیس و دبیر بنے بیٹھے ہیں۔ ایک دبلا پتلا۔ دوسرا بھاری بھرکم۔ سریندر پرکاش خدا نظر بد سے بچائے اچھا خاصا پہلوانی جثہ رکھتے ہیں اور باتوں سے پتہ چلا کہ کبھی کبھی نئے افسانے کے مسائل طے کرنے کے سلسلے میں اس جثے سے کام بھی لے ڈالتے ہیں۔ افسانہ بھی خوب لکھتے ہیں۔ کھانا بھی خوب پکاتے ہیں۔ مجھے بہت للچایا کہ گوشت ایسا پکا کے کھلاؤں گا کہ آپ ہونٹ چاٹیں گے۔ میں نے کہا کہ بھائی میں ماش کی دال کا رسیا ہوں۔ گوشت تو روایتی طور پر کھاتا ہوں۔ اس پر اس بھلے مانس نے اپنی پکائی ہوئی ماش کی دال کا وہ مضمون باندھا کہ میں یاروں کے ساتھ افتاں و خیزاں اس کے گھر جو بمبئی کے کہیں پچھواڑے میں تھا کھنچا چلا گیا۔ بس یہ سوچ کر کھاتا چلا گیا کہ آخر یہ ماش کی دال ہے اور ایک علامتی افسانہ نگار کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہے۔

سریندر پرکاش کی ماش کی دال اور قرۃ العین حیدر کے یہاں کا تربوز، یہ دو ذائقے یاد رہیں گے۔ صاحب، قرۃ العین حیدر نے کیا تربوز کھلایا اور میں کھاتا چلا گیا۔ اس گمان میں کہ

صرف تربوز کھانا ہے مگر اس کے بعد سوتیوں کا زردہ سامنے آ گیا۔ وہ بھی کھایا۔ جب کھا پی کر فارغ ہو بیٹھے تو شامی کباب آ گئے۔ کالیداس گپتا رضا نے میرے کان میں کہا کہ آپ کو لینے آیا ہوں۔ بھابی کو ساتھ لیں اور چپکے سے ہم تینوں نکل چلیں۔

میں نے رازدارانہ کہا۔ "ذرا چائے تو حلال کر لیں"۔

مجھ غریب کو کیا پتہ تھا کہ قرۃ العین حیدر سن رہی ہیں۔ بس بکھر گئیں۔ "ہاں ہاں جائیے میں آپکو نہیں روکوں گی"۔

میں تو بھیگے بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ مگر خیر تھوڑی ہی دیر میں طوفان کا رخ سریندر پرکاش کی طرف ہو گیا جو نئے افسانے کے مسئلہ پر ان سے بھڑ گئے تھے۔

کالیداس گپتا رضا کے ساتھ تھوڑی خلوت رہی۔ اور پھر انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس مسلمانوں کے دینی علوم کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ "مگر میں مسلمانوں کو یہ ذخیرہ نہیں دکھاتا"۔

'کیوں؟"

"یہ لوگ اپنے علمی سرمائے کی قدر نہیں کرتے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ قرآن میں نے ایک مسلمان کے گھر میں سخت ابتر حالت میں دیکھا۔ اس ناقدرے سے میں نے دس روپے میں خریدا۔ پھر مسلمانوں کی دینی انجمنوں نے ایک لاکھ تک اس کی قیمت لگائی۔ میں نے کہا کہ یہ ایک لاکھ کی رقم سے زیادہ قیمتی چیز ہے"۔

"آپ رضا کس چکر میں بنے"۔

"شیعہ مولویوں سے میری بہت دوستی رہی ہے۔ سلام اور نوحے بھی میں نے لکھے ہیں۔ نیا مجموعہ ابھی ابھی آیا ہے۔ "شعورِ غم"۔

کلب سے نکلتے ہوئے کالیداس کہنے لگے۔ "آپ مالابار ہلز دیکھیں گے۔ وہ علاقہ دیکھنے کا ہے۔ وہاں HANGING GARDEN ہے۔ بڑا بڑا قدیم درخت نظر آئے گا"۔

"بالکل دیکھوں گا اور وہاں تو ہمارے قائداعظم بھی رہتے تھے۔ شاید آپ کو پتہ ہو کہ



کونسی جگہ رہتے تھے"۔

۷۔ اورنگ زیب میں دلی میں دیکھ چکا تھا۔ باہر باہر سے۔ منیر شیخ نے گزرتے گزرتے اشارہ کیا: "یہ جو کوٹھی نظر آ رہی ہے، ۷۔ اورنگ زیب روڈ۔ اسے اب ہم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی کلچرل سنٹر قسم کی چیز یہاں بنائیں گے"۔

مگر کالیداس گپتا کو قائداعظم کی رہائش گاہ کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ بھیگی رات میں اس پُرفضا علاقہ کی سیر کی اور چلے آئے۔

ہاں اسی شہر بمبئی میں کنہیا لال کپور سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ لمبے لگ لگ۔ بھولے بھالے، ہنس مکھ۔ جس کسی نے بات کی جواب میں شعر پڑھ دیا۔ نثر بحالتِ مجبوری بولتے تھے۔ باتیں شعروں میں کرتے تھے۔ میں نے کہا: "کپور صاحب آپ تو ہر بات شعروں میں کیا کرتے ہیں"۔ بولے: "پرانے شاعر سب باتیں کہہ گئے ہیں۔ پھر ہمیں اپنی طرف سے کوئی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"کپور صاحب۔ اپنے دوست مظفر علی سید آپ پر کام کر رہے ہیں"۔

'ہاں۔ سید صاحب کا خط آیا تھا۔ میں نے انہیں لکھ بھیجا ہے کہ یہاں ایک سکھ مجھ پر کام کرنے کے درپے تھا مگر ایک سکھ کے ہاتھوں جھٹکا ہونے کے مقابلے میں مجھے ایک سید کی چھری سے ذبح ہونا منظور ہے"۔

ویسے مظفر علی کی تنقید کے وہ بہت معترف تھے۔

ادھر کنہیا لال کپور رخصت ہوئے۔ ادھر ہم نے بمبئی کو سلام کیا۔ وہ صبح گئے۔ ہم شام گئے وہ پونا کو۔ ہم اورنگ آباد کو۔ بمبئی سے نکل کر میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔

صبح اورنگ آباد میں کی۔ اب میں اپنی جون میں ہوں۔ یہ اورنگ آباد کا احسان ہے۔ اسکی اس ٹھنڈی اجلی صبح کا جو ٹریفک کے شور سے پاک ہے۔ میں یہاں کے ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں اینڈ کر سفر کی تکان اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر کیسی تکان۔ کوئل کی ایک کوک نے

نے تازہ دم کر دیا۔ اور میں تڑپ کر باہر نکل آیا۔ کتنا خوب شہر ہے۔ لگتا ہے کہ یہاں آدمی کم اور کوئلیں زیادہ آباد ہیں۔ درختوں میں شور بہت ہے۔ سڑکوں پر شور بہت ہی کم۔ اور گھر کچھ کچے کچھ پکے۔ کوئی چھوٹا مقبرہ۔ کوئی ٹوٹا قلعہ۔ جب میں شہر میں داخل ہو رہا تھا تو شیواجی بیچ چوراہے میں گھوڑے پہ سوار چمکتے دمکتے دکھائی دیتے تھے۔ شہر کے باطن میں اترا تو دیکھا کہ ایک گوشے میں سراج اورنگ آبادی سوئے ہوئے ہیں۔ دوسرے گوشے میں اورنگ زیب محوِ خواب ہیں۔ سادہ سی چہار دیواری کے اندر کچی قبر۔ اس پہ ایک پودا لگا ہوا۔ اوپر کھلا آسمان۔ قبر کا مجاور بتانے لگا کہ شہنشاہ کی وصیت یہی تھی کہ ان کی قبر کچی بنائی جائے۔ اس وصیت نے اپنا اثر دکھایا۔ میں نے کم از کم اس گھڑی میں اس شہنشاہ پر اپنی ساری تنقید واپس لے لی۔

سراج اورنگ آبادی اس شہر کے تاریخی قبرستان کے بیچ ایک سفید مقبرہ کے اندر آرام کرتے ہیں۔ ایک گھنی املی نے اس چھوٹے سے مقبرے پہ سایہ کر رکھا ہے۔ سراج اورنگ آبادی کی قبر پھولوں سے بھر جائے اور اس املی کا سایہ سدا اس پر قائم رہے۔ یہاں میں نے اپنے اس سفر میں پہلی بار کوئل کے درشن کیے۔ قریب کے ایک پیڑ پر کوئلیں ہی کوئلیں اور سب بے حجاب۔ ورنہ کوئل تو پردہ کرتی ہے۔

اورنگ آباد نے ایک ہی دن میں نہال کر دیا۔ اور بشیر نواز اور رفعت نواز کیا خوب بھائی ہیں۔ مہمان نوازی ان پر ختم ہے۔ بشیر نواز بمبئی سے ہمیں ساتھ لے کر آئے۔ رفعت نواز اجنتا تک اور اجنتا سے آگے جل گاؤں کے سٹیشن تک ساتھ رہے اور ایک بھائی اور ملا۔

"میں حمایت علی شاعر کا بھائی ہوں۔"

بڑا بھائی شاعر، چھوٹا بھائی شعور۔ بتانے لگا کہ میں جماعتِ اسلامی پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ لاہور آنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ بھائی جگ جگ آؤ۔ مگر آپ نے بہت دیر کر دی۔ پہلے آ جاتے تو مولانا مودودی سے نیاز حاصل کرتے۔ اب آؤ گے تو میاں طفیل محمد کو پاؤ گے۔

ابلورا، اورنگ آباد کے پچھواڑے میں ہے۔ اسی کی خاطر تو اورنگ آباد کا سفر اختیار کیا تھا



مگر احمد ہمیش کو اورنگ آباد اتنا بھا گیا کہ ابلورا کے سفر میں اس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

ایلورا۔ چٹانوں کے بیچ سانس لیتی ہوئی تین مذہبی روایتیں۔ ہندو، بدھ، جین۔ رہو اور رہنے دو کے اصول پر ایک کی بغل میں دوسری، دوسری کی بغل میں تیسری۔ تینوں ہی کی ایک ایک جھلک دیکھی تھی اور گیوریٹر نے گھوم پھر کر بہت سی تفصیلات بتائی تھیں مگر اب کچھ یاد نہیں ابلورا ایک خواب تھا۔ میں نے خواب دیکھا اور بھول گیا۔ بہت یاد کرتا ہوں مگر واضح تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ بدھ اور جین والے گوشے تو بالکل ہی حافظہ سے اتر چکے ہیں۔ یاد کرنے پر بس اتنا یاد آتا ہے کہ کیلاش مندر میں بھٹک رہا ہوں۔ اونچائی پر چڑھتے چڑھتے ایک چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں داخل ہوتا ہوں تو ایک دم سے ایک لحیم شحیم ہاتھی کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ پھر آگے کوئی لاٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ ستون، کوئی بلند قامت مورتی۔ اوپر دیکھتا ہوں۔ ترشی ہوئی چٹان اس طرح جھکی نظر آتی ہے کہ اب گری۔

اجنتا کی راہیں اجاڑ ہیں۔ اجنتا جتنا قریب آتا جاتا ہے ویرانی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ پہاڑیاں جو دائیں بائیں نظر آ رہی ہیں کتنی ویران نظر آ رہی ہیں۔ ان پہ کھڑے ہوئے درخت پتوں سے بے نیاز ہیں۔ بالکل جھنکاڑ۔ جلے بھنکے سے۔ مگر کسی کسی شاخ کے بیچ یہ حرکت کیسی ہے۔ لنگور؟ اور پھر میں غور سے دیکھتا ہوں۔ ان درختوں میں جابجا لنگور ہیں۔ مگر درخت اور لنگور اتنے ہم رنگ ہیں کہ پہلی نظر میں ان کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ مٹیالی رنگت، منہ پر کالونس تپی ہوئی۔ یہی کلر سکیم ان درختوں اور پہاڑوں کی ہے اور وہ غار قطار اندر قطار۔ وہ کون اہلِ جنوں تھے جنہوں نے دنیا جہان کو تج کر ان اندھیرے غاروں میں فن کی جوت جگائی نقش بنائے، مجسمے تراشے۔ مہاتما بدھ کو کس کس عالم میں دکھایا گیا ہے۔ ایک ہی چہرہ ایک زاویہ سے دیکھو تو مسکراتا ہے، دوسرے زاویہ سے دیکھو تو اداس دکھائی دیتا ہے۔ سامنے سے دیکھو تو شانت۔ مگر میں اس طرح ان غاروں کو بیان کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ اس طرح کبھی کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ بیان کی گرفت میں آیا ہے؟

ایلورا بھی دیکھ لیا۔ اجنتا بھی دیکھ لیا۔ چلو واپس دلّی چلیں۔ اجنتا سے نکل کر خوش خوش جل گاؤں سٹیشن پہنچے۔ اس بھروسے پر کہ غفور صاحب نے فون کر کے ہماری نشستیں ریزرو کرا دی ہوں گی۔ مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ نشستیں ریزرو نہیں ہوئی ہیں اور گاڑی میں ویسے کوئی جگہ نہیں مل سکتی تو میرے تو قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ سٹیشن ماسٹر نے مجھے تو نوٹر کا سا جواب دے دیا مگر پھر احمد ہمیش آگے بڑھا اور رجز پڑھی کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم پاکستان کے چوٹی کے ادیب ہیں۔ حکومتِ ہند نے ہمیں بطورِ خاص مدعو کیا ہے اور ہم وی آئی پی کی حیثیت سے یہ سفر کر رہے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اگر پریس کو یہ پتہ چل گیا کہ پاکستان کے دو چوٹی کے ادیب جل گاؤں سٹیشن پر بھٹک رہے ہیں تو کل ہندوستان کے سارے اخبارات میں یہ خبر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوگی اور آپ کے لئے صفائی پیش کرنا مشکل ہو جائے گی"۔

میں ڈر رہا تھا کہ سٹیشن ماسٹر اس تقریر سے پتہ نہیں ہمیں کیا سمجھے مگر وہ سادہ دل تو رعب میں آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر ٹیلی فون کھڑکائے۔ بالآخر بھساول سٹیشن ماسٹر کو تھوڑا منایا۔ ہمیں اُدھر جاتی ایک گاڑی میں بٹھایا اور کہا کہ وہاں سے آپکو سیٹیں مل جائیں گی۔

مگر بھساول کا سٹیشن ماسٹر بہت کٹھور نکلا۔ احمد ہمیش نے اپنی جل گاؤں والی تقریر جوں کی توں دہرا دی مگر وہ ذرا جو متاثر ہوا ہو۔ یہی کہے گیا کہ "گاڑی آنے پر پتہ چلے گا۔ سیٹیں خالی ہوئیں تو مل جائیں گی"۔

جب ہم پوری طرح ناامید ہو چکے تو سٹیشن ماسٹر صاحب بولے: "آپ میں سے کوئی لاہور سے بھی آیا ہے"۔

میں نے کہا: "یہ خاکسار لاہور سے آ رہا ہے"۔

"اچھا آپ لاہور سے آ رہے ہیں۔ گوالمنڈی کا کیا حال ہے"۔ گوالمنڈی کی خیریت پوچھی پھر ایف۔ سی کالج کی۔ پھر کہنے لگا: "میں تلوک چند محروم کا بھتیجا ہوتا ہوں"۔

میں نے کہا کہ حضرت پھر آپ پکڑے گئے۔ سیٹ نہیں ملی تو بس آپ کے گھر جا کر دھرنا



دیں گے"۔

اور پھر اس سٹیشن ماسٹر نے کمال دکھایا۔ کسی ریلوے افسر کے خاندان کے لئے دو ڈبے ریزرو تھے۔ اس سے فون پر بات کی اور پتہ نہیں کیا افسوں پھونکا کہ اس نے اپنا ایک ڈبہ ہمارے حوالے کر دیا۔

تلوک چند محروم کو سُورگ میں جگہ ملے، ان کی لاہور سے نسبت، لاہور سے ہماری نسبت کہاں جا کر کام آئی۔ اب ہم اپنے ڈبے میں پھیلے بیٹھے ہیں اور دلی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ نارنگ صاحب نے گاڑی کے سفر کا جو مشورہ دیا اس کا فائدہ اب کھلا۔ گاڑی دوڑ رہی ہے اور میں سمجھ رہا ہوں کہ میں دوڑ رہا ہوں۔ میرے ساتھ زمین دوڑ رہی ہے۔ درخت دوڑ رہے ہیں۔ جنوبی ہند سے زندگی میں یہ میرا پہلا تعارف ہے۔ آتے ہوئے تو کچھ پتہ ہی نہ چلا تھا۔ دلی سے اڑے اور بمبئی میں اتر گئے۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ یہاں کی زمین کیسی ہے۔ درخت کیسے ہیں۔ بیچ بیچ میں زمین کتنی اجاڑ دکھائی دیتی ہے جیسے ویرانے میں سفر کر رہے ہیں۔

رات سفر۔ پھر دن سفر۔ اور اب دن ڈھل رہا ہے۔ کھیت جو تھوڑی دیر پہلے تک دھوپ میں جل بل رہے تھے۔ اب چھاؤں میں ہیں۔ چھاؤں پھیلتی گہری ہوتی جا رہی ہے۔ وہ دور کھیت میں ایک مور نظر آیا۔ دوسرا مور۔ یہاں تو بہت مور نظر آ رہے ہیں۔ یہ مور کچھ زیادہ ہی مور نظر آ رہے ہیں۔ دم زیادہ لمبی، زیادہ پھیلی ہوئی، زیادہ نیلی کلغی، زیادہ باوقار۔ یہ کونسا علاقہ ہو سکتا ہے۔ یکایک مجھے خیال آتا ہے کہ آگرہ تو گزر گیا ہے پھر یہ کون سی نگری ہے۔ میں تیزی سے اٹنڈنٹ کے پاس جاتا ہوں۔

"اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

جواب ملتا ہے۔ "متھرا آنے والا ہے"۔

بالکل ٹھیک۔ یہ مور برندابن ہی کے ہو سکتے ہیں۔

اب میں پھر دلی میں ہوں۔ اور اب یہاں چل پھر رہا ہوں جیسے زمانہ ہو گیا یہاں آئے ہوئے۔ دلی کی دوپہریں اب خوب گرم ہو گئی ہیں۔ ان دوپہروں کی ہواؤں نے لُو کا رنگ پکڑ لیا ہے۔ میں اس میں بھی خوش ہوں۔ لوؤں میں دوڑتے پھرنا بچپن میں کتنا اچھا لگتا تھا کیا دلی کی دوپہروں کے اس سفر میں گئی دوپہروں میں سے کوئی دوپہر اپنے درشن دے سکتی ہے۔ مگر ابھی ایک سفر اور درپیش ہے۔ نارنگ صاحب خوشخبری سناتے ہیں کہ لکھنؤ چلنا ہے اترپردیش اردو اکیڈمی نے بلاوا بھیجا ہے۔ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔

لکھنؤ تو بہت گرم نکلا۔ رام لعل نے صحیح خبردار کیا تھا کہ لکھنؤ سوچ سمجھ کر آنا۔ وہاں نوجوان تم سے نبٹنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ ہم ابھی پہنچے ہی تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی جا کر پروفیسر رضوان علوی کے کمرے میں ذرا دم لیا تھا کہ دو نوجوان آ دھمکے۔

"آپ سے باتیں ہونی ہیں۔"

میں نے کہا: "مقرر ہونی ہیں۔"

بولے: "آج ہی ہونی ہیں۔ وقت طے ہو جانا چاہیئے۔"

انہوں نے وقت اور مقام ایسے طے کیا جیسے ڈوئل کے لئے وقت اور مقام طے کیا جاتا ہے۔

ان نوجوانوں میں ایک تھے شہنشاہ مرزا، دوسرے تھے انیس اشفاق۔ معرکہ کا وقت، دوپہر، کھانے کے بعد۔ مقام ڈاکٹر نیر مسعود کا مکان۔ ہم ڈاکٹر نیر مسعود کے یہاں ضرور گئے لیکن اتنی بھاگ دوڑ میں تھے کہ اطمینان سے بیٹھنا، باتیں کرنا ممکن نہیں تھا۔ نوجوانوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ کل باتیں ہوں گی۔ یہیں اسی مقام پر۔ اسی وقت۔

ایک گلی سے دوسری گلی میں۔ دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ عالیہ کو عَلم خریدنے ہیں۔ انیس اشفاق اور ان کی بہن کی قیادت میں گلی گلی دکان دکان چھان رہی ہیں۔ میں اس موقعہ کو غنیمت جانتا ہوں۔ لکھنؤ کی گلیوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہاں سے فارغ ہو، بھاگم بھاگ ریسٹ ہاؤس، جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہاں سے الٹے پاؤں گنگا پرشاد



میموریل ہال، جہاں ہماری خاطر ایک تقریب کا اہتمام ہے۔ حیات اللہ انصاری صدارت کر رہے ہیں۔ ویسے اترپردیش اردو اکیڈمی کے صدر پروفیسر رضوان علوی ہیں۔ سیکرٹری زیدی صاحب ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شبیہ الحسن بھی موجود ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ لکھنؤ، جو کبھی شہرِ نگاراں تھا اب شہرِ افسوس ہے۔ یہ شہرِ افسوس اپنے پاکستانی مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ ساتھ میں انہوں نے مراثی مرزا دبیر مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کا بھی افتتاح کر ڈالا۔

لکھنؤ میں دوسرا دن، پہلی صبح۔ درگاہ شاہ نجف، چھوٹا امام باڑہ، بڑا امام باڑہ، درگاہ حضرت عباس۔ شاہ نجف میں داخل ہو گئے۔ بس گھڑی بھر کے لئے لگا تھا کہ میں نجف میں ہوں۔ دوسرے امام باڑوں کو بس دیکھا اور واپس۔ امام باڑہ آصف الدولہ نے عالیہ کو کتنا مایوس کیا۔ نہ ضریح نہ تعزیہ نہ عَلم۔ ریذیڈنسی بھی دیکھی جہاں نواب حضرت محل نے ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں مورچہ بنایا تھا۔ کیا گرم مورچہ ہو گا کہ ہر دیوار گولیوں سے چھلنی نظر آتی ہے۔ اس عمارت کو فرنگیوں کے گولوں گولیوں نے ڈھایا۔ درختوں کو وقت نے جھکایا۔ کتنے سن رسیدہ درخت ہیں کہ جھک کر دوہرے ہو گئے ہیں۔ کسی کسی کی کمر اتنی جھکی ہوئی کہ زمین کو چھوتی ہے وہاں سے چلے تو پھر ایک پسماندہ علاقہ میں جا کر گلیوں سے نکلتے نکلتے ایک احاطہ میں داخل ہوئے۔ یہاں میر انیس سوتے ہیں۔ قبر بھی بس اٹکل ہی سے بنائی گئی ہے۔ اٹکل سید مسعود حسن کی۔ انہوں نے ٹھیک ہی تعین کیا ہو گا۔ بہرحال اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہلِ لکھنؤ انیس کے کتنے قدردان ہیں۔

مئی کی دوپہر۔ پروفیسر نیر مسعود کی بیٹھک۔ انیس اشفاق نوجوانوں کا دستہ لے کر آن پہنچے۔ عابد سہیل ان کی کمک پہ تھے۔ مجھے کب کب کا حساب دینا پڑ گیا۔ یہاں آ کر مجھے اپنے دوست مظفر علی سید کی لکھنے میں احتیاط کی پالیسی کا قائل ہونا پڑا۔ اس یارِ عزیز کا طور یہ رہا کہ مضمون لکھنے کے لئے قلم اٹھایا اور لکھتے لکھتے قلم کو روک لیا، فقرہ لکھا اور لکھ کر

کاٹ دیا۔ یہ سوچ کر کہ اگر صدی بعد یہ بیان رد ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اور اگر اگلی نسلوں نے اس مسترد رائے کو پڑھ لیا تو میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ بس اس اندیشہ میں مظفر علی سید کے یہاں نہ جانے کتنے سخن ہائے گفتنی ناگفتہ رہ گئے۔ اپنا طور یہ رہا کہ آج اس وقت جو سمجھ میں آیا ہے لکھ دو۔ لکھ دیا۔ کل کا خیال ہی نہیں کیا۔ اگلے دن جو سمجھ میں آیا وہ لکھا۔ یہ بھول ہی گئے کہ کل کیا سمجھ کر کیا لکھ چکے ہو۔ اس وطیرے کا خمیازہ ہندوستان میں آ کر اٹھانا پڑا۔ ہندوستان میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک یار نے خبردار کیا کہ تم نے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی نزاکت کو ملحوظ رکھے بغیر اور یہ سوچے بغیر کہ منشی پریم چند کا جشن سو سالہ منایا جا رہا ہے۔ اس بزرگ کے افسانوں پر رائے دے ڈالی ہے۔ دوستوں نے کچھ رسالے دکھائے کہ دیکھو تمہارے لکھے پر کیسی بحث گرم ہے۔ اور پریم چند کے مجاور تمہارے کیسے پرزے اڑا رہے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں اپنے کسی مضمون کے اقتباسات دیکھے اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہ بات میں نے کب اور کہاں لکھی تھی۔ بہت یاد کرنے پر کچھ کچھ یاد آیا کہ شاید اب سے سولہ برس پہلے یا شاید بیس برس پہلے ایسا کوئی مضمون لکھا گیا تھا۔ اور میں حیران ہوا کہ اچھا میں بیس برس پہلے اتنی خراب نثر لکھتا تھا۔ بس کچھ اسی قسم کی صورتحال مجھے اس محاسبہ میں در پیش تھی۔ کسی پندرہ برس پہلے لکھے ہوئے مضمون کا حوالہ، کوئی پچیس برس پہلے کی کہی ہوئی بات۔ میں اپنی کہی ہوئی بات کو سنتا اور یہ یاد کرنے کی کوشش کرتا کہ یہ بات میں نے کب اور کہاں لکھی تھی۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ قسمت کی بات فائر بریگیڈ اس وقت پہنچا ہے جب جائے واردات پر نئی عمارت بھی بن چکی ہے۔ وہ تو یہ کہئے کہ نارنگ صاحب نے بر وقت اپنے مہمان کی خبر لی ورنہ لکھنؤ میرے لئے کوفہ بن چکا تھا۔

لیجئے اس پہ مجھے انور عظیم یاد آ گئے۔ یوں بُرے نہیں مگر مردلیست از بدایوں مجبور است۔ ترقی پسندی ان کا بدایوں ہے۔ دو گھنٹے تک انٹرویو کیا۔ پورا انٹرویو ٹیپ کیا کہ کہیں بعد میں مکر نہ جاؤں۔ پوچھا کہ گلی کوچے کے افسانے اب آپ کو کیسے نظر آتے ہیں؟



میں نے کہا کہ یار انہیں اب پڑھ کر تھوڑا شرمندہ ہی ہوتا ہوں کہ اب وہ مجھے بہت خام نظر آتے ہیں۔ اب جو میں ہندوستان ٹائمز میں انور عظیم کو اپنے پہ رواں دیکھتا ہوں تو سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا کہا؟ انہوں نے کیا سمجھا۔ ویسے انور عظیم بھی اپنی جگہ سچے ہیں۔ اپنے حساب سے بات کرتے ہیں کہ جیسا اوّل دن لکھا تھا عین بعین ویسا ہی آج تک لکھے جا رہے ہیں۔

خیر ذکر لکھنؤ کا تھا۔ نیر صاحب کے گھر سے نکلے تو چلے بھاگم بھاگ گاندھی بھون کی طرف۔ بیگم حیات اللہ انصاری نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے ہماری خاطر تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جیسے تیسے اس تقریب سے نبٹے اور بھاگے رام لعل کے گھر کی طرف۔ رام لعل کے گھر دوستوں کا ہجوم ہے۔ کھانا بھی کھانا ہے، دوستوں سے باتیں بھی کرنی ہیں اور گاڑی بھی پکڑنی ہے۔ دل پوری کچہری میں پڑا ہے۔ کان ریل کی سیٹی پر لگے ہیں۔ آخری لقمہ کے ساتھ قلانچ بھری اور سیدھے پلیٹ فارم پر۔ لکھنؤ کو سلام۔ اب ہم الٰہ آباد چلتے ہیں۔

الٰہ آباد کا سفر تو بہت مبارک ثابت ہوا۔ وہاں پہنچ کر منشی پریم چند سے اپنی رشتہ داری نکل آئی۔ اصل میں عالیہ اپنے میکے سے ملنے کے لئے بیتاب تھیں۔ میکے کے نام ایک پھوپی اماں، تین باجیاں، ایک بنارس میں دو الٰہ آباد میں۔ ان دو میں ایک باجی زہرہ پریم چند کی بڑی بہو نکلیں۔ سری پت رائے کی بیگم۔ مگر سری پت رائے ان دنوں الٰہ آباد میں نہیں تھے۔ ...
پریم چند کے چھوٹے صاحبزادے امرت رائے سے البتہ ملاقات ہوئی۔ ہوا یوں کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے نوجوان علی احمد فاطمی نے دلی ہی میں یہ سن گن لے لی تھی کہ مجھے اپنے عزیزوں سے ملنے الٰہ آباد بھی جانا ہے۔ سو عین اس دن ایک شام افسانہ کا اہتمام کیا۔ ساتھ میں اقبال متین کی نئی کتاب "آگہی کے ویرانے" کی افتتاحی تقریب۔ الٰہ آباد میں ایک شام ہی تو گزارنی تھی، سو وہ اس تقریب کی نذر ہو گئی مگر تقریب معقول تھی۔ اردو والوں کے علاوہ ہندی والے بھی دکھائی پڑ رہے تھے۔ امرت رائے اپنا افسانہ لے کر آئے ہوئے تھے۔ امرت رائے ہندی کے لیکھک ہیں۔ میں مستعد ہو بیٹھا کہ چلو ایک محفل ایسی بھی ہوئی جس میں میں ہندی کا افسانہ

سنوں گا مگر عجیب ہندی تھی۔ میں منتظر ہی رہا کہ کوئی فقرہ کوئی مکالمہ ایسا آئے کہ میں اسے ہندی جانوں۔ آخر میں میں نے طے کیا کہ یہ اردو افسانہ تھا جو ہندی میں لکھا گیا۔

الہ آباد سے نکل کر بنارس کی راہ لی۔ اس سفر میں شوکت تھانوی مرحوم بہت یاد آئے۔ جس گاڑی میں جگہ ملی وہ بالکل سودیشی ریل نکلی۔ ہر چار قدم کے بعد رک کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی اپنی مرضی سے رکتی۔ کبھی اترنے والوں کی مرضی سے رکتی جیسے جہاں اترنا ہوا اس نے زنجیر کھینچی اور گاڑی کے رکنے پر بستر کمر پہ رکھ تھیلا گلے میں ڈال اتر گیا۔ گاڑی جب اپنی مرضی سے رکتی تو پھر خدا خدا کر کے ہی حرکت میں آتی۔ تو ہماری گاڑی چیونٹی کی چال سے چلی۔ الہ آباد سے بنارس تک کا سفر دلی سے لکھنؤ تک کے سفر سے زیادہ طویل نظر آیا۔ وہ تو یہ کہئے کہ آم کے پیڑ ہمسفر تھے۔ ورنہ پتہ نہیں اپنا کیا حال ہوتا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ اس نواح میں جو پیڑ ہوتا ہے وہ آم ہی کا پیڑ ہوتا ہے۔ ویسے آم اگر پک چکے ہوتے تو شاید مجھے بھی ایک دو دفعہ زنجیر کھینچنی پڑتی۔

جب الہ آباد سے چلے تھے تو یہ سوچا ہی نہیں کہ عزیزوں کو کس گاڑی کی اطلاع دی ہے اور سوار کس گاڑی میں ہو رہے ہیں۔ جس گاڑی کو بعد میں آنا تھا وہ پہلے آگئی۔ پہلے آنیوالی کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کب آئے۔ سو جو گاڑی سامنے آکر رکی اس میں بیٹھ لئے۔ اب جو بنارس پر اترتے ہیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں مگر صاحب سفر شرط ہے۔ مسافر نواز مل ہی جاتے ہیں، جیسے ہمیں ایک سکوٹر رکشہ والا مل گیا۔

"آپ پریشان نظر آرہے ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"پاکستان سے۔"

"اچھا پاکستان سے آرہے ہیں۔ آپ ان رکشہ والوں کے چکر میں نہ پڑیں۔ میں پہنچاؤں گا آپکو۔ جانا کہاں ہے۔"

"نوابوں کی ڈیوڑھی میں۔"



"ٹھیک ہے۔ بیٹھ جائیے۔"

چار قدم چل کر بولا: "کیا حال ہے پاکستان کا۔"

"اچھا حال ہے۔"

"لوگ خوش ہیں۔"

"بہت خوش ہیں۔"

تھوڑا رکا۔ پھر بولا: "دیکھئے۔ آپ مجھ پر شک مت کریں۔ بات یہ ہے کہ پہلے تو ہم آپ اکٹھے ہی تھے۔ اب الگ الگ ہوئے ہیں۔ پاکستان سے کوئی آتا ہے تو پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ وہاں لوگوں کا کیا حال ہے۔"

میں نے کہا: "اچھا اب آپ اپنا بھی تو تعارف کرائیں۔"

"صاحب۔ مجھے پانڈے کہتے ہیں۔ میں بنارس کا نہیں ہوں۔ بس یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔"

"پانڈے جی۔ آپ یہاں کیسے پھنسے۔"

"مت پوچھئے صاحب۔ اچھی بھلی نوکری کر رہا تھا کہ ایک سالا عشق ہو گیا۔ وہ تھی بنارس والی۔ اس کے چکر میں یہاں آیا۔ نوکری چھوڑ رکشہ چلانی شروع کر دی۔"

رکا۔ پھر بولا: "بابو صاب! آپکو اینٹری بھی تو کرانی ہے۔"

"بعد میں کرالیں گے۔"

"بعد میں کہاں کرائیں گے۔ کراتے چلئے۔ دیر نہیں لگے گی۔" اور اس نے رکشہ پولیس آفس کی طرف موڑ دی۔

پولیس آفس میں جہاں جہاں اینٹری کرانے کے لئے خود جانا پڑا پولیس والے روکھے پھیکے ہی نظر آئے۔ مگر بنارس کے پولیس آفس والے کیا متواضع نکلے۔

"پاکستان سے آرہے ہیں۔"

"جی۔"

"اچھا بیٹھیں۔ پہلے رس گلے کھائیں۔"

ابھی ابھی رس گلوں سے بھرا کلھڑ بازار سے دفتر پہنچا تھا۔ میں نے بہت معذرت کی مگر پھر سوچا کہ رس گلے ہی تو ہیں۔ یہ کیا پتہ تھا کہ سفر نے گلا خشک کر دیا ہے۔ رس گلا آسانی سے حلق سے نہیں اترے گا۔ پہلا ہی رس گلا حلق میں پھنس گیا۔ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے۔ پانی کیسے مانگوں؟ یہ بنارس شہر ہے۔ یہ پنڈت لوگ اپنے باسن میں پانی مجھے کہاں پلائیں گے۔ مگر ایک بھلے مانس نے میرا احوال دیکھا اور جھٹ پٹ پانی کا گلاس ہاتھ میں تھما دیا۔ دو گھونٹ پیئے۔ رس گلا نیچے اترا۔ جان میں جان آئی۔

اندراج کرتے کرتے مہاشے جی نے پوچھا: "پاکستان کا کیا حال ہے۔"

"اچھا حال ہے۔"

"مہنگائی کتنی ہے۔"

"زیادہ نہیں۔"

"کیسے حالات ہیں؟"

"حالات ٹھیک ہیں۔ مگر دیکھیئے بات یہ ہے کہ پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ اسکے لئے مسائل تو ہیں۔"

"مسائل۔" مہاشے جی ہنسے۔ "مسائل ہندوستان کے کم ہیں۔ پاکستان سے زیادہ ہیں۔"

پانڈے نے چلتے چلتے پوچھا: "بنارس دیکھنے کا ارادہ ہے؟"

"بالکل ارادہ ہے۔"

"تو پھر میرے ساتھ چلیئے۔ صبح پانچ بجے آجاؤں گا۔ دوپہر تک سارا بنارس دکھا دونگا۔"

مجھے یہ پیش کش بہت بھائی مگر پھر میں نے سوچ کر کہا: "اچھا اپنے میزبانوں سے پہلے پوچھ لیں۔"



"ہاں ہاں ضرور پوچھ لیں۔ یہ آگئی نوابوں کی ڈیوڑھی۔"

مگر ہمارے میزبانوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ میں نے باہر آکر بہت دکھے دل سے پانڈے سے معذرت کی۔ وہ بھی بہت افسردہ ہوا۔ پھر گرمجوشی سے گلے ملا اور رخصت ہوگیا۔

"میں حیران ہوتی ہوں۔" عالیہ کی باجی مغل کہنے لگیں۔ "اُدھر سے جو لوگ آتے ہیں انکے اندر کتنی نفرت بھری ہوتی ہے۔"

میں چونکا۔ وہی قرۃ العین حیدر والی شکایت۔ آپ لوگ ہندوستانی مسلمانوں کو اتنی حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں۔

"آپ کو کیسے یہ گمان گزرا۔"

"یہاں آکر پہلے تو وہ کہتے ہیں کہ ارے یہاں لوگ بولتے کس طرح ہیں۔ اور پھر یہاں کے لوگوں کی نقلیں اتارتے ہیں۔"

"دیکھیئے جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ ہمارے آپ کے عزیز رشتہ دار ہیں نا۔"

"جی۔"

"تو ان کی تو عادت ہی یہ ہے۔ ادھر وہاں کے لوگوں کی زبان کی نقلیں اتارتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں تھے تو بنگالیوں کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ لوگ بولتے کس طرح ہیں۔"

"پھر وہ کہتے ہیں کہ ارے یہاں لوگ رہتے کس طرح ہیں۔"

اور پھر قرۃ العین حیدر کے فقرے میرے ذہن میں گونج گئے۔ میں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی اور اس وسیع و عریض حویلی کا جائزہ لیا۔ پھر میں نے سوچا کہ جب اس حویلی میں رہنے والی خاتون نے ان باتوں سے اتنا اثر لیا ہے تو معمولی گزر بسر کرنے والوں پر یہ کچھ سن کر کیا گزرتی ہوگی۔

مجھے یونہی ایک ناول کا خیال آتا ہے۔ زوئگ کا 'BEWARE OF PITY' مجھے قرۃ العین حیدر نے خبردار کر دیا ہے۔ لگتا ہے کہ انہوں نے وہ سب مضمون پڑھے ہیں جو

ہندوستان سے واپسی پہ پاکستانی اخبارات میں لکھے جاتے ہیں اور جو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جذبۂ ترحم سے لبریز ہوتے ہیں۔ دردمندی ایک صالح انسانی جذبہ ہے مگر رحم، یہ نازیبا حرکت ہے۔ بالعموم خود لیتے اپنے احساسِ برتری کے اثر میں اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم نے ہندوستانی مسلمانوں پہ بہت ترس کھایا۔ انہوں نے سہا۔ اب وہ سہنے کے لئے تیار نظر نہیں آتے۔

"انتظار صاحب۔ یہ بتایئے کہ آپ واپس جاکر لکھیں گے کیا۔"

اب رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آرہا ہے۔ اصل میں ہندوستانی مسلمان مجھ سے یہ سوال کر رہے ہیں۔ تم کہ آج ایک احساسِ برتری کے ساتھ ہمارے درمیان آبیٹھے ہو۔ واپس جاکر ہمارے متعلق کیا بتاؤ گے۔ کیا تم اپنے جائز اور ناجائز الاٹمنٹوں اور کالی سفید کمائی کی روشنی میں ہمارے رہن سہن پہ محاکمہ کرو گے۔ تمہیں یاد ہے کہ تم ہمیں کس عالم میں چھوڑ کر گئے تھے اور اب جبکہ بہت دردسہ کر ہم نے یہ جانا ہے کہ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو۔ کوئی ہماری مشکل کشائی کو نہیں آئے گا تو تم مشفق بن کر یہاں آئے ہو ــــ میں سخت سٹ پٹایا ہوا ہوں کہ ان لوگوں نے مجھے تاڑ لیا ہے۔ میں قرۃ العین حیدر کی ساری حیثیت کو بھول کر یہ دیکھ رہا تھا کہ ان کے پاس کار نہیں ہے جبکہ اپنے پاکستان کی ادیبائیں بالعموم موٹر والیاں ہیں۔ مگر میرے اپنے پاس کار کہاں ہے۔ کار ناصر کاظمی کے پاس بھی نہیں تھی۔ منیر نیازی، احمد مشتاق، شہرت بخاری کے پاس بھی نہیں ہے۔ سوائے مورکھ ترس مت کھا۔ صبا کوئی تیرے پلے نہیں آنکلے۔ اور تجھ پہ ترس کھائے۔ سو اب میں کسی مسلمان دوست کے بارے میں یہ نہیں کریدوں گا کہ وہ پرانی دلی کی کسی گلی میں رہتا ہے یا کسی نئی کالونی میں پلاٹ الاٹ کرا کے اس نے نئے ڈیزائن کا مکان بنا لیا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میری طرف سے برتری کا مظاہرہ اب انہیں منظور نہیں۔ میں ان کی باتیں سنتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ اب وہ سہمے سمٹے نظر نہیں آتے۔ ان کے اندر ایک نئی سی رمق دوڑتی نظر آتی ہے جیسے لوٹ پیٹ کر



مر کھپ کر انہیں جینا آگیا ہے۔

شام کا وقت ہے۔ میں بنارس کی گلیوں میں گھومتا پھرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ یہاں کے در و دیوار ہندوستان کے دوسرے شہروں سے کتنے مختلف ہیں۔ ہر برہمن بچہ لچھمن و رام ہو نہ ہو مگر ہر گھر ایک چھوٹا سا مندر نظر آتا ہے۔ ڈیوڑھی کے آگے چبوترے پہ شوجی کی مورتی۔ اس کے سامنے نندی بیل۔ کہیں شوجی غائب ہیں اکیلا نندی بیل بیٹھا ہے۔ دروازے پہ نیلے پیلے رنگوں میں ہنومان جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ کہیں رامچندر جی لچھمن جی تیر کمان سے مسلح کھڑے ہیں۔

بنارس میں میری پہلی اور اکلوتی صبح۔ کس ذوق و شوق کے ساتھ گھاٹ پہ پہنچا ہوں۔ مگر یہ کیا۔ نہ اشلوک نہ بھجن، ایک دکان سے رفیع کی آواز آرہی ہے۔ رفیع کی آواز میں غالب کی غزل۔ غالب نے آج مجھے پہلی مرتبہ بور کیا ہے۔ میں یہاں کا اس لئے آیا ہوں کہ غالب کو سنوں۔ گھاٹ کو دیکھا۔ گنگا جی کے پاٹ کو دیکھا۔ مگر صبحِ بنارس کہاں ہے۔ اہلیا بائی کے گھاٹ کو بھی جھانک لیا۔ یہاں تھوڑی پردہ داری ہے۔ میں نے تاک جھانک کر کے اشنان کرنے والیوں کا جائزہ لے لیا ہے۔ کوئی کندن بدن نہیں۔ کسی پہ جوبن نہیں۔

چلو پھر فاطمان چلیں کہ وہ بنارس کی کربلا ہے اور شیخ علی حزیں بھی وہیں آرام کرتے ہیں قبر ان کے اپنے ہی شعروں سے مزین ہے۔ کوئی آڑا لکھا ہوا، کوئی ترچھا لکھا ہوا۔ ؎

روشن شد از وصال تو شبہائے تارِ ما

صبحِ قیامتست چراغِ مزارِ ما

اور ڈیوڑھی سے باہر ان کے خدمت گار رمضانی کی قبر ہے اور یہ قبر شیخ کی قبر سے زیادہ اونچی اور زیادہ شاندار نظر آتی ہے۔

"کیوں صاحب، شیخ علی حزیں کی قبر تو سیدھی سادی ہے مگر ان کے خدمت گار کی قبر کیا بلند و بالا ہے اور کیا سجی بنی ہے۔"

"بات یہ ہے کہ رمضانی جنات میں سے تھے۔ جن کی قبر تو ایسی ہی ہونی چاہئے"۔

یہ بام بلند اور یہ زینہ۔ اصل میں یہ سیتا جی کی رسوئی ہے۔ میں اسے دور سے دیکھتا ہوں اور گزر جاتا ہوں کہ مجھے سارناتھ پہنچنے کی جلدی ہے۔ سارناتھ۔ آنا شاکیہ منی کا گیا سے چل کر اس استھان پہ اور ملاقات کرنا ان کا اپنے پانچ سنگھیوں سے اور پھر انہیں اپدیش دینا۔ مہاتما بدھ کا پہلا اپدیش۔ دھرم چکر پرورتن۔ اور وقت کا چکر۔ عقیدت مندوں نے کس اہتمام سے اس مقامِ آغاز کو محفوظ کیا۔ لاٹھ کھڑی کی ستون تعمیر کئے، خانقاہیں بنائیں بھکشوؤں نے یہاں ڈیرا کیا۔ پرستاروں کا جمگھٹا ہوا۔ اب کچھ بھی نہیں ہے۔ زمانے کی گردش میں سب کچھ پس گیا۔ جہاں تہاں شکستہ آثار۔ مگر ایک ستون اب بھی اس وقار کے ساتھ کھڑا ہے کہ سارے منظر پر چھایا ہوا ہے۔ نہیں پورے بنارس پر اس کا سایہ پڑ رہا ہے۔ دھامک ستوپا۔ اونچے چبوترے پر کھڑا ہوا ایک بھاری بھرکم بیلن کی شکل کا ستون۔ اس کے اوپر ایک ہشت پہلو ستون۔ میں اس چکر میں پڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ یہ کب تعمیر ہوا، کس نے اسے تعمیر کیا۔ اس کا تعلق اشوک کے زمانے سے ہے یا گپتا عہد سے۔ اور یہ بالائی ستون کیا واقعی شہنشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کے گرد ایک اسرار کی فضا ہے۔ عجب گنبدِ بے در ہے۔ نہ در نہ دریچے۔ پتہ نہیں طوطوں کو اس نے کیسے اپنے اندر راہ دے دی ہے۔ ڈار کی ڈار اڑتی شور مچاتی آتی ہے اور چھوٹی اینٹوں کے بیچ رخنوں میں گم ہو جاتی ہے۔ میں اس قدیم و عظیم ستون کے سامنے میں کھڑا ہوں اور اس کے رعب میں ہوں۔ ایک رعب ایک حیرت، کہ یہ وہ مقام ہے جہاں مہاتما بدھ نے گیان پانے کے بعد گیا سے چل کر ڈیرا کیا تھا۔ اور یہاں اس کے آس پاس انہوں نے اپنا پہلا وعظ دیا تھا۔

تم نے سارناتھ دیکھ لیا۔ یوپی کے آخری کنارے کو چھو لیا۔ سارناتھ کو اپنے سفر کی انتہا جانو اور واپس ہو لو۔ جلدی نکل لو کہ یہ نگر جادو کا نگر ہے۔ مبادا یہ زمین تمہارے پاؤں پکڑ لے۔ یاد کرو شیخ علی حزیں کو ؎



از بنارس نہ روم معبدِ عام است ایں جا
ہر برہمن بچۂ لچھمن و رام است ایں جا

کاشی وشوا ناتھ دوڑی چلی جا رہی ہے۔ کس طوفانی رفتار سے دوڑی ہے کہ رات رات میں یوپی کی ساری زمین ناپ ڈالی۔ اب صبح ہو رہی ہے۔ میں مستعد ہو کر کھڑکی کے پاس آ بیٹھا ہوں کہ ہاپوڑ آنے والا ہے۔ اس ایک صبح میں کتنی صبحیں دھڑک رہی ہیں۔ ہاپوڑ کا سٹیشن بیتی ہوئی صبحوں کے ایک پورے جلوس کے ساتھ آیا ہے۔ چھٹیوں کے دن، گرمیوں کی صبحیں۔ منہ اندھیرے نکل کھڑے ہونا۔ لمبے لمبے ڈگ بھر کر سٹیشن پہ پہنچنا۔ آنے والی گاڑی کے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پہ ٹہلتے رہنا۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے صبح جیسے اجلے کسی چہرے کو صبر کا انعام سمجھنا اور خوش خوش واپس ہونا۔ میں گیٹ کے قریب جا کر باہر نظر دوڑاتا ہوں۔ اس اندیشہ کے ساتھ کہ کہیں سب کچھ بدل تو نہیں گیا ہے۔ کچھ نہیں بدلا ہے۔ سب کچھ اسی طرح ہے، سٹیشن کے باہر بھی سٹیشن کے اندر بھی۔ صرف ایک درخت پر اترتے ہوئے پرندے مجھے نئے اور اجنبی نظر آتے ہیں۔ یہ کون سے پرندے ہیں۔ کہاں سے اڑ کر آئے۔ کب یہاں پہنچے۔ مگر سیٹی بج چکی ہے۔ گاڑی حرکت میں ہے۔ ہاپوڑ اپنی اوجھل گلیوں اور نظر آنے والے درختوں اور پرندوں کے ساتھ پیچھے سرک رہا ہے۔ کاشی وشوا ناتھ غازی آباد کی طرف دوڑ رہی ہے، غازی آباد۔ اس کے آگے دلی۔

پھر وہی دلی۔ پھر وہی صبحیں۔ وہی نارنگ صاحب، وہی بلراج مینرا، وہی محمود ہاشمی، وہی شمس الرحمان فاروقی اور شمیم حنفی۔ وہی کوچہ گردی وہی سیر سپاٹے۔ کبھی حوضِ خاص کی سمت۔ کبھی جامع مسجد کی طرف، کبھی چاندنی چوک کے بیچ۔ مگر اب مئی کا مہینہ آن پہنچا ہے۔ زمین جلتی ہے آسمان بے امان ہے۔ جامعہ نگر کی فضا میں قصبوں والی فضا کا سا ذائقہ ہے۔ اس کی دوپہریں مجھے اپنی بستی کی دوپہروں کی یاد دلاتی ہیں۔ یہاں دوپہر کے ہنگام جب لو چل رہی ہو۔ چلتے چلتے مجھے یوں لگتا ہے کہ میں مانوس رستوں پر چل رہا ہوں جیسے ان دوپہروں میں ان رستو

پر میں بہت چل چکا ہوں ۔ یا شاید یہ رستے میرے کھوندے ہوئے رستوں کی توسیع ہیں ۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے ان کھوندے ہوئے رستوں میں سے کوئی رستہ ایک دم سے میرے قدموں تلے آجائے ۔ یا ان گرم دوپہروں میں سے کوئی ایک دوپہر اچانک سے میرے سامنے آن کھڑی ہو۔ اسے میری بیتی ہوئی ٹیکا ٹیک دوپہر! او! تم کہاں ہو سارے گمشدہ گرم تپتے رستو! میں اپنے ننگے پیروں کے ساتھ تمہاری راہ تکتا ہوں ۔

میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔ دلّے کہ اس دیار کے حساب میں تھے، کس تیزی سے میری انگلیوں سے پھسلے۔ بس اب میرے پاس گنتی کے دن ہیں ۔ انہیں میں کفایت شعاری سے خرچ کروں گا۔ کوئی گھڑی کوئی پل ضائع نہیں ہونا چاہئے ۔ ایک شام کلاں محل خلیق انجم کے گھر چلیں گے اور مزے مزے کا کھانا کھا کر انگلیاں چاٹتے گھر آئیں گے ۔ ایک رات پرویز مہدی کے گھر چل کر کھانا کھانا ہے ۔ ان سے نیا نیا تعارف ہوا ہے ۔ کسی محکمہ میں افسر ہیں ۔ صاحب اور بیگم دونوں کتنے ہنس مکھ ہیں اور ہاں شمس الرحمان فاروقی ۔ ان کے یہاں اسطرح چلنا ہے کہ شام کو شری رام سنٹر میں ہندی کے دوستوں سے ملیں گے ۔ وہاں سے فاروقی صاحب کی طرف ہو لیں گے ۔ اپندرناتھ اشک سے یہیں شری رام سنٹر میں ملاقات ہوئی ۔ مگر عجب ہوا کہ جب تک وہ رہے تو باقی چپ صرف وہ بولے۔ ان کے جانے کے بعد دوسروں نے زبان کھولی۔ سرویشور جی کہ ہندی کے اس وقت کے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں رفتہ رفتہ کھلے کہنے لگے کہ ایک تو سپاہیوں کی وردی ہوتی ہے ، کتنی چست ہوتی ہے اور کتنا رعب کرتی ہے ۔ ایک سادھو سنتوں کا پہناوا ہوتا ہے ۔ یوں ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ لئے نظر آتا ہے ۔ بس ایسے ہی ادب میں زبان اور اسلوب کا معاملہ ہے ۔ بعض کے یہاں اسلوب سادہ ہوتا ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ لئے ہوتا ہے ۔ ایک لکھنے والے وہ ہوتے ہیں جو بہت چست لکھتے ہیں ۔ زبان ایسی لکھتے ہیں کہ اس سے دہشت پیدا ہوتی ہے ۔

اس بات پر مجھے بے ساختہ ناصر کاظمی یاد آیا ۔ میں نے کہا کہ سرویشور جی ۔ ہمارے



یہاں جوش صاحب ایسے ہی اسلوب کے مالک ہیں ۔ کیا جاہ و جلال والی زبان لکھتے ہیں ۔ اپنے شاعر ناصر کاظمی نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ حضرت جوش ملیح آبادی ہاتھی پہ بیٹھ کر تھری ناٹ تھری سے چڑی کا شکار کرتے ہیں ۔

میں نے پوچھا: "بھجن اسی روایتی ڈگر پہ چل رہا ہے یا کوئی نئی راہ نکلی"۔

"کیسا بھجن ۔ اب تو ہم ایشور کے خلاف کوتا لکھتے ہیں"۔

میں نے کہا: "ہندی میں تو مذہبی تجربے کی شاعری کی بہت بڑی روایت ہے ۔ یہ تجربہ لوگوں کے اندر ہنوز زندہ ہے ۔ پھر آپکی شاعری سے کیسے خارج ہو گیا"۔

بولے: "اوّل تو اس تجربے کے اظہار کو تلسی وغیرہ اس اونچائی تک لے گئے کہ اس سے آگے جانا ممکن نہیں ۔ پھر یہ ہے کہ اب ایشور سے ٹکرانے کو جی چاہتا ہے"۔

اردو کی بات کرتے ہوئے کہنے لگے : "جب ہم اودھی اور بھوجپوری کی پرانی شاعری کو اپنی روایت سمجھتے ہیں اور پڑھتے ہیں ۔ حالانکہ وہ پوری زبان ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو پھر ہم غالب کو کیوں نہ پڑھیں اور کیوں اسے اپنی روایت نہ سمجھیں جبکہ یہ زبان ہندی سے زیادہ قریب ہے"۔

تو شامیں تو ٹھیک خرچ ہو رہی ہیں مگر میں اپنی صبحوں کی طرف سے مطمئن نہیں ۔ دیوتی کے طفیل میری صبحیں آنند نکیتن میں گزر رہی ہیں ۔ اور ضائع ہو رہی ہیں ۔ یہ نئی آبادی ہے ۔ یہاں سے وہاں تک ایک طرز کے کوٹھی نما مکان ۔ تنوع نہ سڑکوں کے نقشہ میں ہے نہ مکانوں کے نقشہ میں ۔ درخت ہیں مگر کوئی ایسا درخت دکھائی نہیں دیتا جس سے کوئی روایت وابستہ ہو سکے ۔ کوئی بہت ہی ناسمجھ بندر ہوگا جو ان درختوں پہ آکر جھولے گا ۔ تو میں کس برتے پہ صبح کو گھر سے قدم نکالوں ۔ ہاں صبح ہونے پر دریچہ میں سے باہر جھانک لیتا ہوں ۔ ڈورا جاڑ سا ٹیلہ دکھائی دیتا ہے کیا مجال کہ کبھی کوئی مور گردن اٹھائے کھڑا نظر آئے ۔ صبح کی سیر کرنے والوں کی ٹولیاں جاتی آتی نظر آتی ہیں ۔ ایک ٹولی دریچہ کے قریب سے گزرتی ہے ۔ ارے ان کے بیچ تو ایک لاہوری چہرہ نظر آرہا ہے ۔ اپنے اے پی پی والے حفیظ صاحب ۔ ان کے ساتھ مل کر کتنے قہقہے لگا رہے ہیں ۔

میں نے دیوقی سے ذکر کیا۔ وہ حیران ہوا۔

"یہ پارٹی تو سیوگ سنگھ سے کچھ تعلق رکھتی ہے۔ ورزش کے پروگرام کے تحت صبح کی سیر کو نکلتی ہے۔ قہقہہ پارٹی کہلاتی ہے۔ قہقہہ ان کی ورزش ہے"۔

منیر شیخ کے دفتر میں حفیظ صاحب ملے تو میں نے کہا کہ حضرت آنند نکیتن میں آپ بہت آنند میں ہیں۔ قہقہہ بازوں کے ساتھ خوب چھنتی ہے۔

بتانے لگے کہ: "میرے لیٹر بکس میں کوئی پرچہ ڈال گیا کہ ہولی پارٹی میں شامل ہونا ہے تو چندہ بھیج دیجئے۔ میں نے چندہ بھیجا اور خط لکھا کہ میں مسلمان ہوں اور پاکستانی ہوں۔ آپکو اعتراض نہ ہو تو میں آپکی پارٹی میں شریک ہو جاؤں —— جواب آیا۔ ضرور شامل ہو جائیے۔ تب سے ان سے میل ملاقات ہے"۔

میں ہنسا: "یہ طور ہیں تو دلّی میں کما کھاؤ گے"۔

مگر حفیظ صاحب شاکی تھے کہ "حکومت مجھے دلّی سے قدم نہیں نکالنے دیتی۔ کتنی ہی اپیلیں کر چکا ہوں۔ ہاں ہوں کرتے ہیں۔ اجازت نہیں دیتے"۔

تو یہ ہے آنند نکیتن۔ جس کی صبحوں میں سیوک سنگھیوں کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ کوئل کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ نہ کوئل کی آواز نہ مور کی جھنکار۔ بندروں سے دور رہوں، سخت مجبور ہوں۔ ایسے میں دور سے انور عظیم کی آواز آتی ہے:

"ارے بھائی کہاں ہو۔ تمہاری جلی کٹی سننے کو کان ترس رہے ہیں"۔

انور عظیم آئے اور مٹھائی کا ڈبہ ساتھ لائے۔ میں برفی کھاتا جاتا ہوں اور ان کی تلخ ترش سنتا جاتا ہوں۔ وہی تقسیم کی بحث۔ جب برفی دل بھر کر کھا چکا تو میں نے کہا:

"انور عظیم صاحب۔ قائداعظم تو بعد میں آئے۔ دیاس جی تقسیم کا بیج پہلے ہی بو گئے تھے"۔

تڑپ کر بولے: "دیاس جی؟ کیا مطلب؟"

"دیکھو بھائی انور عظیم، کبھی ترقی پسند ادب کی فضولیات سے فرصت ملے تو مہا بھارت پڑھو



اور حکمت کے موتی رولو۔ رامائن اور مہابھارت ہندوستان کی تقدیر کے نوشتے ہیں جب ایک مرتبہ کورو پانڈو کے درمیان زمین کی تقسیم ہو گئی تو ہندوستان کی تقدیر میں لکھا گیا کہ اب یہاں تقسیم ہوتی رہے گی"۔

"ارے واہ واہ یہ تم کہاں پہنچ گئے"

"کمال ہے یار۔ پہلے تمہیں شکایت تھی کہ میں اسلامی تاریخ میں گھسا رہتا ہوں۔ اب تمہیں اعتراض ہے کہ میں مہا بھارت سے کیوں رجوع کرتا ہوں۔ کیا کریں بھائی حاضر اپنی سمجھ میں ماضی کے وسیلہ ہی سے آتا ہے"۔

یاد آیا کہ اس سے ملتی جلتی بحث دلی یونیورسٹی میں چل پڑی تھی۔ ایک نوجوان سوال پہ سوال کئے چلا جا رہا تھا۔ اسی قسم کے جو لکھنؤ کے نوجوانوں نے کئے تھے۔ صاحب! کتنے خوش فہم لوگ ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی فلسفۂ ہجرت پیش کر ڈالا ہے اور پاکستانی ادب کے لئے ایک تیر بہدف نسخہ لکھ دیا ہے۔ جب اس نوجوان نے بار بار زمین سے وابستگی کا سوال اٹھایا تو میں نے کہا کہ "میرے عزیز! زمین تمہارے لئے ایک روایتی حقیقت ہے اور دھرتی ماتا ایک روایتی عقیدہ ہے مگر ہمارے لئے زمین ایک تجربہ ہے۔ ہم نے ایک زمین کو بہت اذیت کے ساتھ چھوڑا ہے اور دوسری زمین کو ایک تصور کے تحت اپنایا ہے۔ زمین کے اس تجربے کو تم نہیں جان پاؤ گے۔ یہ پانڈوؤں نے جانا تھا یا اب میں نے جانا ہے"۔

مگر نوجوان کی تقریر پھر بھی جاری رہی۔ تب پروفیسر امیر الحسن عابدی کہ اس یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے سربراہ ہیں اور اب تک منہ بند کئے بیٹھے تھے اُبل پڑے: 'میاں! ہم یہاں تمہاری تقریر سننے نہیں آئے مہمانوں کو سننے آئے ہیں'۔

اصل میں یہاں کے شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر فضل الحق نے ہمیں بلایا تھا اور اردو اور فارسی والوں کو تھوڑا اکٹھا کیا تھا۔ مختصر سی محفل تھی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی میرِ محفل تھے۔

خواجہ احمد فاروقی میرٹھ کالج کے اولڈ بوائے نکلے۔ شاید اسی رشتے سے وہ مجھ پہ زیادہ شفقت کر رہے تھے۔

اے لو یہ تو ۱۰ مئی آ گئی۔ میں نے کیا سوچا تھا ہوا کیا۔ سوچا تھا کہ ۸ مئی میرٹھ میں گزاریں گے، ۹ دلّی میں۔ پھر واپسی کریں گے مگر وہ تو ویزا کی آخری تاریخ ہی ۱۰ مئی ہے کل میں آخری بار ریوتی کے ساتھ جا کر چاندنی چوک کا چکر لگا آیا۔ آخری بار جامع مسجد کے نواح کا دیدار کیا۔ آخری بار دُور سے لال قلعہ کو ایک نظر دیکھ لیا۔ جامع مسجد کو سلام، جمنا کو سلام، چیلوں کے کوچے کو سلام۔

اب صبح رخصت ہے۔ صبح ہی سے دوستوں کا تانتا بندھ گیا ہے جو یہاں آنے سے رہ گئے ہیں وہ ایئر پورٹ پر ملیں گے۔

۱۰ مئی کی گھڑیاں کتنی تیزی سے گزر رہی ہیں۔ صبح کتنی عجلت میں رخصت ہوئی۔ یہ اس دیار میں میری آخری صبح تھی۔ اب دوپہر ہے۔ جہاز اڑنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ دوستوں کا جمگھٹا ہے۔ نارنگ صاحب، بیگم نارنگ، میزا، محمود ہاشمی، بلراج کومل، شمیم حنفی، بیگم شمیم حنفی، اپنا یارِ دیرینہ سنگھ، اور ریوتی۔ ہاں منیر شیخ بھی آن پہنچا ہے۔ یا مجھے دلّی نے زیادہ پکڑ لیا یا منیر کو سفارتی مصروفیات نے زیادہ گھیرے رکھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہمیں تمہیں تو لاہور میں ملنا ہے۔

دلّی شاد، لکھنؤ آباد، علی گڑھ سدا گلابی رہے۔ سرسیّد کی قبر پہ پھول برسیں، سراج اورنگ آبادی کی قبر پہ چھاؤں کرتی املی حسبِ حال شاخِ نہالِ غم ہری رہے۔ کوئل کی کوک سے آباد بستیوں کو سلام۔ اس بستی کو بھی جو نادیدہ رہ گئی۔ الوداع الفراق! سوئے وطن جاتا ہوں میں۔

پلک جھپکی اور لاہور آیا۔ پھر وہی زندگی ہماری ہے۔ وہی زمیں وہی آسماں، وہی ٹی ہاؤس کے در و دیوار، وہی زاہد ڈار، وہی یاروں کی درماندگیاں، خستہ حالیاں، وہی تھکن



وہی بوریت۔ دفتر کا سفر جاری، چلنے کو رکشہ کی سواری۔ اجنتا ایلورا سارناتھ سب خواب ہوئے۔ شاہجہانی مسجد بھی خواب، چاندنی چوک بھی خواب۔ میں ہندوستان کے سفر پہ گیا بھی تھا؟ میں شک میں پڑ جاتا ہوں اور مجھے اچانک سے وہ بندر یاد آ جاتا ہے جو علی گڑھ اور ڈبائی کے درمیان سڑک کے بیچوں بیچ دم پھیلائے لیٹا تھا۔ اس کی دم نے رستہ دیا تھا یا نہیں دیا تھا۔ ہندوستان اصل میں تو دم کے اس پار سے شروع ہوتا ہے!

سنہ ۱۹۸۰ء

# زمین اَور فلک اَور

پھر وہی ندا، پھر اسی طور اسی اور کھنچا چلا جاتا ہوں جیسے کوچہ چیلاں میں چل پھر رہا ہوں۔ جامع مسجد پہنچا ہوں اور تھک کر سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا ہوں جیسے نظام الدین اولیا کی درگاہ میں ہوں اور امیر خسرو کے آستانے پہ حاضری دے رہا ہوں۔

حاتم طائی کو پہاڑ سے ندا آئی تھی۔ ایک بنگالی کہانی میں بار بار سمندر سے آواز آتی ہے اور ایک سندر ناری کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔ مجھے بھی ندا آتی ہے مگر کسی پہاڑ، کسی سمندر سے نہیں، چھوڑی ہوئی دیدہ و نادیدہ بستیوں سے۔ ایک بستی سے تو مسلسل ندا آتی ہے، کب سے آ رہی ہے۔ مگر اب رفتہ رفتہ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ وہاں جانے کا حکم نہیں ہے۔ بس ندا کے سحر میں رہنا ہے۔ مگر یہ نئی پکار، بس یہ تو یک لخت آئی اور اس گھڑی آئی جب مجھے بالکل مایوسی ہو گئی کہ اب دلّی جانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

میر سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ کب سے آیا ہوا تھا۔ اپنا رویہ یہ تھا کہ ابھی دو ڈھائی سال پہلے دلّی کا پھیرا لگا آئے ہیں سو تردّد کیوں کریں۔ اجازت ملی چلے جائیں گے نہیں ملی نہیں جائیں گے۔ اور دل میں چوری چھپے ایک آس کہ شاید اکیڈمی آف لیٹرز کے دل میں خدا نیکی ڈال دے اور وہ جانے کا بندوبست کر ہی دے۔ مگر جب دن گزرتے

گزرتے بس پانچ دن رہ گئے تو میں نے سوچا کہ اب آس چھوڑ دینی چاہئے۔ اجازت ملنی ہوتی تو مل گئی ہوتی۔ بس اس کے بعد ایکا ایکی جیسے کسی پکارنے آ لیا ہو۔ پوری دلی ایک دم سے تصور میں گھوم گئی۔ جیسے کوچہ چیلاں میں ہوں۔ جیسے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوں۔ جیسے درگاہ نظام الدین اولیاؒ میں ہوں ـــــ گھڑی رات کی تھی۔ ایک سخت دلچسپ کتاب پڑھ رہا تھا کہ دھیان بٹ گیا اور کہیں سے کہیں پہنچا۔ اب کیا کیا جائے۔ خیال آیا کہ جن دوسرے دوستوں کو دعوت نامہ آیا ہوا ہے ان کی خیریت پوچھی جائے۔ کشور ـــــ ہاں اس بی بی کے لئے بھی تو بلاوا ہے۔ فوراً ٹیلی فون کھٹکھٹایا۔ اس غیر وقت میں میرا فون کرنا اس بی بی کو ـــــ اسے تعجب ہونا ہی تھا۔

"اس وقت؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"بس جوشِ عشق۔"

"جوشِ عشق!" ایک چھناکے دار قہقہہ۔

"اصل میں دلی یاد آ رہی ہے۔"

"دلی" ـــــ پھر ایک قہقہہ۔

"یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ سنجیدہ مسئلہ ہے۔ کل تک میرے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا بس یہی سوچا تھا کہ اجازت ملی تو چلے جائیں گے مگر اب جبکہ یہ طے ہو گیا ہے کہ نہیں جانا تو دفعتاً مجھے دلی یاد آنے لگی ہے۔"

"یہ کیسے طے ہو گیا کہ تم نہیں جا رہے۔"

"طے ہونے میں باقی کیا رہ گیا ہے۔ اب تو کوئی وقت ہی باقی نہیں رہ گیا۔ چار پانچ دن بیچ میں ہیں۔ اب سے پانچویں دن سیمینار شروع ہے۔"

"ارے یار۔ چار دن تو بہت ہوتے ہیں۔ یہاں دن کے دن سب کچھ ہو جاتا ہے



دفتری معاملات کا تمہیں تجربہ نہیں ہے۔"

"اچھا تو ابھی آس رکھی جائے اور انتظار کیا جائے۔"

ایک دن اور آس و یاس کے عالم میں گزرتا ہے۔ مگر یہ دن گزارنے کے بعد میں اپنے دل و دماغ سے یہ خیال جھٹکتا ہوں۔ منہ اندھیرے آنکھ کھل جاتی ہے۔ سوچتا ہوں دلی کی صبحوں کے انتظار میں لاہور کی صبحوں کو کب تک ضائع کیا جائے۔ بس نکل پڑتا ہوں۔ ایک چکر لارنس باغ کا۔ واپس آتا ہوں تو ایک تار آیا رکھا ہے۔ میر سیمینار میں جا سکتے ہو مگر خرچ اخراجات تم جانو وہ جانیں۔

سخت بیزار ہوتا ہوں۔ اب کونسا وقت رہ گیا ہے۔ پاسپورٹ میں ہندوستان کا اندراج، پھر ویزا جس کے لیے اسلام آباد جانا پڑے گا۔ پھر سٹیٹ بنک کے پی فارم کا جھگڑا بیچ میں جمعہ پڑتا ہے۔ بالکل ناممکن۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔

پھر کشور کو فون۔

"لو۔ پروانۂ راہداری آ گیا۔ ظالموں نے کیسے تنگ وقت پہ بھیجا ہے۔ تمہیں بھی آ گیا ہو گا۔"

"نہیں۔ مجھے نہیں آیا۔"

"بہرحال۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میری گاڑی لو۔ فوراً پاسپورٹ آفس کا رخ کرو اور اس کے بعد فوراً ہی اسلام آباد چلے جاؤ۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مت ماری گئی ہے۔ مگر پھر کشور ناہید کی باتوں سے بدن میں بجلی بھر جاتی ہے۔ پاسپورٹ آفس۔ وہاں سے اسلام آباد۔ مار دھاڑ کر کے ویزا لیتا ہوں۔ الٹے پیروں واپس آتا ہوں۔ تو جمعہ بیچ میں آن کھڑا ہوا۔ اس کے بعد ۱۹ مارچ۔ سہ پہر کو میر سیمینار کا افتتاح ہے اور میرے لئے اس دن کی صبح قیامت کی صبح ہے۔ سٹیٹ

بنک کی دفتری کارروائی جو ایک لمبا عمل ہے۔ پھر جہاز میں نشست کا مقابلہ اور مرے کو مارے شاہ مدار۔ اوپر سے بارش ہونے لگی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں مگر اس ایثار پیشہ خاتون کو دیکھو کہ خود جانے سے رہ گئی ہے مگر مجھے دھکیلنے پہ تلی ہوئی ہے۔ ایک ایئر ایجنسی کی بی بی کے ہاتھوں میں مجھے دیدیا ہے جس نے کس پھرتی سے مجھ سے سارے مراحل طے کرائے اور پھر بھری برسات میں میں عالیہ کے ساتھ جہاز میں سوار ہوتا ہوں اور چل پڑتا ہوں۔ اطمینان کا سانس لیتا ہوں مگر اطمینان کا سانس کہاں.... اب امنڈتی گھٹائیں رستہ روک رہی ہیں...... موسم میں فوکر کی سواری سے پناہ مانگو۔ ایک دفعہ پشاور سے آتے ہوئے میں اس تجربے سے گزر چکا ہوں۔ فوکر نے بس دو تین مرتبہ غوطے کھائے تھے۔ میرا تو پلیتھن ہو گیا۔ مگر اب فوکر غوطے پہ غوطہ کھا رہا ہے اور میں مطمئن بیٹھا ہوں۔ مجھے اطمینان ہے کہ اب میرا دلی پہنچنا مقدر ہو چکا ہے۔ یہ امنڈ گھمنڈ گھٹائیں اس فوکر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

تو صاحب بعد از خرابیٔ بصرہ ہم دلی پہنچ ہی گئے۔ منور بھابی، شمیم حنفی، ریوتی ائرپورٹ پہ دوستوں کو دیکھا۔ جان میں جان آئی۔

"اور نارنگ صاحب کہاں ہیں"۔

"اجلاس میں۔ بس شروع ہونے والا ہے۔ سیدھے وہیں چلنا ہے۔ انتظار ہو رہا ہوگا"۔

تو ہم تیر کے موافق ائرپورٹ سے نکلے اور زن سے اجلاس کے پنڈال میں۔ بس ابھی تلاوتِ کلامِ پاک ہوئی تھی۔ جمیل جالبی کراچی سے اور افتخار عارف لندن سے آتے بیٹھے تھے پھر جو ایک نظر ڈالی تو برابر میں خالد علی بیٹھے نظر آئے۔ اور ایک دم سے میری آنکھوں کے سامنے منیر شیخ کی بسورتی صورت آ گئی۔

"اچھا۔ تم دلی جا رہے ہو۔ یار میں بھی جا رہا تھا۔ وہیں تم سے ملاقات ہوتی۔ ماس میڈیا سیمینار کے لیے نامزد ہوا تھا۔ سب تیاری ہو گئی تھی مگر سفارت خانے سے ٹیلیگرام آ گیا خالد علی وہاں پہلے سے موجود ہیں۔ اب وہی شرکت کریں گے۔ یار بندھا بستر کھل گیا"۔

"میرے عزیز نیل کنٹھ!"

"نیل کنٹھ کیا؟"

"بالکل نیل کنٹھ۔ باقی سب توجیہات فضولیات ہیں۔ بس وقتِ سفر نیل کنٹھ سے بچ کر چلنا چاہیئے"۔

مگر نیل کنٹھ کو میں طاقت مانتا ہوں منیر شیخ نہیں مانتا۔ اس نے سنی ان سنی کی۔ کہا:

"اچھا یار۔ دلی کو ہمارا سلام کہنا"

کونسی دلی کو۔ یاروں کی اپنی اپنی دلی ہے۔ میری دلی تو وہی امیر خسرو اور میر والی اجڑی بچھڑی دلی ہے۔ جیسا ہمارا دل ویسی ہماری دلی ؎

دلِ خرابہ گویا دلی شہر ہے

مگر منیر شیخ نے اس نگر میں رہ کر اور ہی دلی دریافت کی۔

"ہاں اگر تمہاری دلی کے درشن ہو گئے تو سلام کہہ دوں گا"۔

"ہوں گے۔ ضرور ہوں گے۔ آج رات بیٹھ کر کچھ خط لکھوں گا"۔

تو خیر، اب افتتاحی اجلاس ختم ہو رہا ہے۔ جمہوریہ ہند کے نائب صدر جناب غلام حسین ہدایت اللہ اپنا خطبۂ صدارت پڑھ چکے۔ نارنگ صاحب شکریہ ادا کر چکے۔ اب چائے کا وقفہ ہے۔ ہم یاروں سے گلے ملتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں مگر اب وہ پہلی والی بیتابی نہیں نہ وہ حیرانی کہ اچھا یہ وارث علوی ہیں، یہ شہریار ہیں، یہ محمد علوی ______ اب سب دیکھے بھالے ہیں۔ چہرے جانے پہچانے ہیں اور جیسے کل ہی تو مل کر گئے تھے۔ اب اتنی جلدی ملاقات ہو گئی۔ سیمینار کی ایک نشست، دوسری نشست، تیسری نشست مقالوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور بیچ بیچ میں کیسا مقالہ آتا ہے کہ بے ساختہ ہونٹ کرنے

کو جی چاہتا ہے۔ مگر میں پاکستان سے آیا ہوں۔ معزز مہمان ہوں۔ تقریباً بیٹھا ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ باقر مہدی یہ فریضہ بطریقِ احسن ادا کر رہے ہیں۔ ایسی مخلوقات بھی درمیان میں رہنی چاہئیں کہ ان سے کچھ تہذیبی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اب یوں دیکھئے کہ باقر مہدی نہ ہوتے تو پتہ نہیں ظ۔ انصاری کہاں تک جاتے۔ جنہوں نے ان کا گرم و سرد دیکھا ہے وہ ہمارے کان میں بار بار کہہ رہے تھے کہ ظ۔ صاحب کے مختصر اوراق پر مت جایئے۔ ان کے یہاں لکھے ہوئے کے ساتھ پیغام زبانی بھی تو ہوتا ہے مگر جب وہ پیغام زبانی پر آتے باقر مہدی بیچ میں ٹوک دیتے:

"صاحب۔ مقالہ پڑھئے مقالہ!"

اور جب ظ۔ صاحب مقالہ پڑھتے پڑھتے آپ بیتی پر اتر آئے اور جینے کی تمنا کو مختصر کرتے ہوئے صرف دس سال اور مانگے تو باقر مہدی تڑپ کر بولے:

"دس سال زندہ رہے تو اور برا لکھو گے۔ کم کرو۔ آدھا کر دو۔ پانچ سال۔ ہاں پانچ سال بہت ہیں"۔

خیر ظ۔ صاحب تو اپنوں میں سے ہوئے مگر اس ظالم نے تو ایک وزیر کے ٹنگڑی مار دی۔ انہوں نے میرؔ کا شعر بتا کر آتشؔ کا شعر پڑھ دیا۔ یہ حضرت تڑ سے بولے:

"یہ تو آتشؔ کا شعر ہے۔ میرؔ کو کانوں میں مت گھسیٹو"۔

وزیر موصوف نے کہا: "ہے تو یہ میر ہی کا شعر۔ اچھا خیر آپ سے الگ ملیں گے اور طے کریں گے"۔

"آپ مجھ سے کیسے ملیں گے۔ میں نے آپکو ملاقات کا ٹائم کہاں دیا ہے"۔

تو یہ باقر مہدی ہیں جو ایک راجندر سنگھ بیدی کو چھوڑ کر سب سے سینگ لڑانے کیلئے مستعد رہتے ہیں۔ یہ ظ۔ انصاری ہیں جو اس وقت باقر مہدی کی زد میں ہیں۔ یہ وارث علوی ہیں جو اپنی تنقید میں مرکھنے بیل ہیں مگر یہاں آکر اردو کے پروفیسروں کے نرغے میں آ



گئے ہیں جو ان کے مقالے کو تنقید کے زمرے سے نکال کر انشائیہ کے خانے میں دھکیلنے کے درپے ہیں اور یہ پروفیسر کاظم علی خاں ہیں جو دلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کی ہوا باندھ رہے ہیں کہ جس شہر نے میر کی قدر کی وہ لکھنؤ ہے۔ اور یہ ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی، تیوری پر بل پڑے ہوئے..... "لکھنؤ؟ کیا فضول شہر ہے۔ میر کو اس طرح مارا کہ اس کی قبر کا پتہ نہ چلنے دیا۔ اس نے سب اپنے شاعروں کے ساتھ یہی کیا۔ انیس کے ساتھ بھی"..... اور یہ ہیں پروفیسر آل احمد سرور، گھڑی میں تقریر بزرگ گھڑی میں خوش مزاج۔ ادھر جمیل جالبی مقالہ پڑھ رہے ہیں اور ادھر یہ بزرگ میرے کان میں کھسر پھسر کر رہے ہیں کہ:

"میں تمہارا بہت قائل ہوں"۔

"قبلہ سرور صاحب۔ کشورِ پاکستان میں آپ قائل صرف ایک ہماری دوست کے ہیں۔ باقی سب وضعداریاں ہیں"۔

کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔

تو کیسے کیسے لوگ دلی میں جمع ہیں۔ از انجملہ ہوں میں بھی۔ تو گویا میں اس وقت دلی میں ہوں۔ ایک ایک چہرے کو دیکھنا، در و دیوار پر نظریں دوڑانا، بدلی ہوئی زمین کو بدلے ہوئے آسمان کو ایک نگاہِ شوق سے دیکھنا اور حیران ہونا کہ اچھا میں واقعی اس سمے اس گھڑی دلی میں ہوں۔ ع

جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

جب میں یہاں پچھلی مرتبہ آیا تھا تو بس جیسے خواب میں آیا اور خواب میں چلا گیا۔ پوری دلی ایک خواب کی طرح مجھ پہ چھا گئی تھی۔ مگر اب خواب ٹوٹ رہا ہے۔

لیجئے سیمینار تو تمام ہو گیا۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ شہر شہر سے آئے ہوئے نقاد اور محقق چڑیوں کی طرح اڑ گئے۔ بس اب ہم پاکستان کے "نیو" دانے ہیں اور اہلِ دلی کا جوشِ میزبانی ہے محفل محفل جانتے ہیں۔ گلوں میں گجرے ڈلواتے ہیں، دعوتیں اڑاتے ہیں، داد سے گود دیں

بھرتے ہیں۔ جمیل جالبی اپنی نثر پر، افتخار عارف اپنی نظم پر۔ ارے صاحب اس جوانِ رعنا کو تو ہم گھر کی مرغی سمجھتے تھے اور ٹی وی کے ناموروں میں جانتے تھے۔ اس کی شاعری کے جوہر اس دیار میں آ کر ہم پر کھلے۔ محفلوں کو اس نے اگر لوٹا تو برحق لوٹا۔ اب ہماری نثر کا احوال بھی سن لیجئے۔ ساہتیہ اکیڈمی میں جا کر افسانہ سنایا۔ وہاں مختلف زبانوں کے لکھنے والے اکٹھے تھے۔ ایک پنجابی کا لیکھک ہم سے ٹکرا گیا۔ وہی اعتراض کہ اتنے بے شعور کیوں ہو کہ حاضر کی حقیقتوں کو نہیں پہچانتے۔ دیومالائی دنیا میں بھٹکتے پھرتے ہو۔ اس بندۂ عاجز نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیئے ـــــ سچ کہتے ہو۔ میرے پاس اپنے حق میں کہنے کے لئے کوئی بات نہیں ہے۔

لیکھک، فاتحانہ شان سے مسکرایا۔

"کہہ بھی کیا سکتے ہو۔ میں سریندر پرکاش کا دوست ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کے علامتی اور تجریدی افسانے کا سب پتہ ہے"۔

اس نازک وقت میں ایک بی بی نے بیچ میں آ کر میری جان بچائی۔ میرے افسانے پر (یہ افسانہ "کشتی" تھا) ایسی داد دی کہ میں خود شرمندہ ہو گیا۔ من آنم کہ من دانم۔

دوست نے کان میں کہا: "یہ ہندی کی چوٹی کی ناول نگار ہیں"۔

کہئے تو معزز پاکستانی مہمانوں کے اعزاز میں ہونے والی تقریبوں کے نام بھی گن دوں۔ ایک جلسہ انجمن ترقی اردو میں۔ ایک محفل دلی یونیورسٹی میں۔ ایک تقریب کا اہتمام بیسویں صدی اور رحمٰن نیر کی طرف سے۔ ادھر انبالہ کے مشاعرے سے نپٹ کر کچھ شاعر دلی آن پہنچے ہیں۔ احمد فراز، عطاءالحق قاسمی، پروین فنا سید، شمیم اکرام الحق، اجمل نیازی۔ وہ اپنے زور پر گلے میں گجرے ڈلوا رہے ہیں اور داد و تحسین سمیٹ رہے ہیں۔

اور دعوتیں ہی دعوتیں۔ کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں کہاں کہاں جا کر نکلا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں، شاہد مہدی کے یہاں، عنوان چشتی کے یہاں، شارب ردولوی کے یہاں کہ افتخار عارف کے یارِ غار ہیں۔ انیس دہلوی کے یہاں، احسن عسکری کے یہاں کہ آگے ہم ان



کے افسانے پڑھتے تھے اور انہیں ابنِ سعید کہتے تھے۔ اب سیدھے سیدھے حسن عسکری بن کر سفارت خانۂ پاکستان میں اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔

میں نارنگ صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ہم دونوں نارنگ صاحب کے لئے، سب ہی کے لئے باعثِ زحمت بنے ہوئے ہیں۔ اب سنو کہ روز تڑکے میں مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ وہی ندا کی سی کیفیت۔ کیا یہ مور ہیں جو پکارتے ہیں یا بس ایسے جیسے ہیں، کہیں کوئی کو وہ ندا ہو۔ اور پھر میں اچانک چونکتا ہوں۔ اپنے آپ پر نفرین بھیجتا ہوں کہ اے غافل! تو تقریبوں اور دعوتوں میں پھنس گیا۔ دلی تجھے پکار رہی ہے۔ اس جال سے نکل اور دلی سے مل۔ مگر کیسے ـــــ یا اللہ یہ تقریبوں، دعوتوں، ملاقاتوں کا سلسلہ کب ختم ہوگا کب دلی سے ملاقات ہوگی۔ انیس دہلوی، ترکمان دروازے کے اندر کہیں رہتے ہیں۔ ایک اونچی سی مسجد کے برابر انگلی جیسی گلی میں۔ ان کے یہاں کھانے پر جاتے جاتے شمس الرحمٰن فاروقی نے مسجد کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کالی مسجد ہے"۔

"کیا کہا۔ کالی مسجد"۔

"ہاں۔ کالی مسجد۔ یا شاید کلاں مسجد تھی۔ مگر بگڑ کر کالی مسجد بن گئی۔ ویسے یہ پہلے کالے رنگ ہی کی تھی۔ یہ مسجد اپنے طرز کی مسجد ہے۔ دلی کی باقی مسجدوں سے الگ۔ التمش کے زمانے میں شہر کے حاکم نے شہر میں سات مسجدیں بنوائی تھیں۔ ساتوں بالکل انوکھی مسجدیں ہیں ـــــ"

"باقی چھ کہاں ہیں"؟

"کسی وقت میرے ساتھ چلو۔ سب مسجدیں دکھاؤں گا"۔

"پھر بھائی فاروقی۔ سیمینار کے اثراتِ مابعد سے مجھے نکالو۔ مسجدیں دکھاؤ، مزاریں دکھاؤ اور وہ سب کچھ دکھاؤ جس سے دلی عبارت ہے"۔

لیجئے شمس الرحمٰن فاروقی نے تو سچ مچ جھرجھری لے لی۔ صبح ہی صبح قافلہ آراستہ ہوا۔ فاروقی صاحب ان کی بیگم یعنی ہماری بھابی، قمر احسن، یہ حقیر فقیر اور عالیہ۔ باقی مسجدیں بعد میں پہلے ہم مسجد قوۃ الاسلام دیکھیں گے اور قطب مینار کی سیر کریں گے۔ قطب مینار پہلے بھی دیکھا ہے۔ پھر دیکھیں گے۔ ع

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

اور مسجد قوۃ الاسلام سے پرے یہ مزار کیسا ہے۔ صاحب یہ امام ضامن کا مزار ہے — امام ضامن کا مزار؟ — اے بدعقیدہ آدمی سوال مت اٹھا۔ خلقت کا اگر یہی عقیدہ ہے تو اس میں کلام مت کر۔

مسجد قوۃ الاسلام کو دیکھا۔ اب کھڑکی مسجد کو دیکھنے ہیں۔ یہ عہد التمش کی سات مسجدوں میں سے ایک مسجد ہے۔ ایک در، دو در، تین چار پانچ چھ سات۔ گنتے جاؤ نہیں گن پاؤ گے۔ یہی تو اس مسجد کا کمال ہے۔ در اندر در پھیلتی چلی گئی ہے۔

مزاروں میں پہلے خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پہ حاضری دی۔ آگے بھی اس مزار پر حاضری دی تھی مگر اس وقت تو یہاں بہت خاموشی تھی۔ آج تو میلہ سا لگا ہوا ہے — آگے آگے دولہا پیچھے پیچھے دلہن۔ ساتھ میں ڈھول والا ڈھول بجاتا چلتا ہے۔ خواجہ کو سلام کرتے ہیں۔ چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ چلے جاتے ہیں۔

پھر حضرت چراغ دہلیؒ کے مزار پہ۔ مزاروں پر کبوتر تو بہت دیکھے تھے مگر یہ مزار موروں کی آماجگاہ ہے۔ مزار پر سایہ کرتے درخت بہت ہرے بھرے ہیں مگر بیچ بیچ میں سے نیلے نظر آرہے ہیں۔ ہری ہری ٹہنیاں اور نیلی لمبی دمیں آپس میں کس طرح گڈمڈ ہیں کہ ایک پر دوسری کا گمان گزرتا ہے۔ یہ دیکھ میں نے جانا کہ حضرت چراغ دہلی سچ مچ چراغ دہلی ہیں۔

ایک پھیرا تغلق آباد کا بھی ہو جائے۔ لال قلعہ واہ — شاہجہانی مسجد سبحان اللہ



چاندنی چوک کے کیا کہنے — مگر اے رہ نوردانِ شوق، دلی جاتے ہو تو تغلقوں کی دلی بھی ضرور دیکھو۔ ویسے اب وہاں دیکھنے کو کچھ نہیں بچا ہے۔ بلندی پر اس کی فصیل اور اس کا اونچا دروازہ۔ مگر اندر قدم رکھو تو سب کھنڈر نظر آئے گا۔ در و بام میں سے اب کچھ سلامت نہیں ہے۔ یہاں سے وہاں تک در و بام ڈھتے ہوئے، اینٹیں بکھری ہوئیں۔

پھر پرانے قلعے نے کیا خطا کی تھی کہ میں اسے نہ دیکھتا۔ اور وہ تو بیچ نئی دلی میں ہے روز ہی آتے جاتے اس پہ نظر پڑتی تھی۔ باہر سے لگتا تھا کہ اندر بہت کچھ ہو گا۔ اندر جا کے دیکھا تو عمارت، برائے نام باقی اللہ کا نام۔ سب کچھ ہی صاف ہو گیا ہے۔ اب یہاں وسیع و عریض قطعے گھاس کے بچھا دیئے گئے ہیں۔

اس مختصر سی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ یہ تھا ہمایوں کا کتب خانہ جہاں سے وہ گرا تھا۔

پھر اس جگہ کو تو دیکھنا چاہیے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے۔ بس اتنی مختصر سی جگہ اتنا تھا ہمایوں کا کتب خانہ۔ اتنا تو جمیل جالبی کے کتب خانے کا ایک گوشہ بنے گا۔

اے لو۔ اسی ہنگام میں ہولی بھی آگئی۔ ہنگاموں میں ایک اور ہنگامہ۔ دل نے کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ ہندوستان آئے ہیں اور بیچ پھاگن آئے ہیں تو پھاگن رنگ بھی دیکھتے چلیں۔ پھاگن رنگ سٹیج پہ تو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ کمانی آڈیٹوریم میں ہولی کی تقریب سے ہر شام کو کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا۔ صبح اٹھ کر ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا — سڑک یہاں سے وہاں تک خالی — میں نے ریوتی کو جھنجھوڑا۔ واضح ہو کہ اب میں ریوتی کے گھر پہ ہوں۔

"یار یہ کیسی ہولی ہے۔ سڑک پہ تو سناٹا ہے"۔

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا: "نو بجے کے قریب ٹولیاں نکلیں گی"۔

"نو بجے کے قریب"۔ میں حیرت زدہ رہ گیا — "یعنی یار لوگ نہا دھو کے ناشتہ

کر کے ہولی منانے نکلیں گے۔ یہ تو نئی قماش کی ہولی ہوئی۔"

"تمہیں پتہ نہیں کہ یہ نئی کالونی ہے۔ جو ہولی تم دیکھنا چاہتے ہو وہ پرانی دلی میں دیکھی جا سکتی ہے مگر بیٹا۔ وہاں جاؤ گے تو طبیعت صاف ہو جائے گی۔"

خیر تو بہت انتظار کے بعد نو بجے۔ ٹولیاں نکلنی شروع ہو گئیں۔ مگر کیا شریفانہ طریقے سے ہولی کھیل رہی تھیں۔ گلال کی پڑیا ہاتھ میں۔ جس سے مڈھ بھیڑ ہوئی اس کے منہ پر گلال مل دیا۔ گلے مل لئے۔ بنارس کے ایک بزرگ نے ایک پیالی تھام رکھی تھی جس میں صندل اور کپور گھلا ہوا تھا۔ جو سامنے آیا ایک پوڑوے کو پیالی میں بھگویا اور ماتھے پہ تلک لگا دیا۔ ہولی دلی کی نئی آبادیوں میں پہنچ کر کتنی مہذب ہو گئی تھی۔

تلاشِ بسیار کے بعد تھوڑا ہولی رنگ۔ ریلوے کلب میں نظر آیا۔ جہاں ریلوے کے افسران بیگمات کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ڈھول ڈھمکا، دھما چوکڑی۔ کیسی کیسی سندر ناری خاک دھول میں اٹی ٹیسو رنگ میں بھیگی کالونس میں لسی بالکل بیچا لگ رہی تھی مگر اس دھج کی بھی اپنی ایک پھبن ہے۔

مگر پتہ ہے کہ اس ہولی نے میرے ساتھ کیا کیا—— ہولی کے دو دن گزار کر علی گڑھ پہنچنا تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے دو روزہ قیام کی دعوت تھی۔ رات کو پروفیسر ثریا حسین کا فون آ گیا کہ یہاں تو ہولی والوں اور پولیس میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے سخت کشیدگی ہے۔ سوچ سمجھ کر آیئے۔ ہمارے سر میں کوئی پھوڑا نکلا تھا کہ ایسے میں وہاں جاتے۔ یوں علی گڑھ کے سفر پہ ہولی نے پانی پھیر دیا۔ کتنی آرزو تھی وہاں جانے کی ——!

علی گڑھ سے تو گئے۔ اب سیدھا لکھنؤ کا رخ کرنا تھا مگر لکھنؤ جانے سے پہلے دلی کا نیا رنگ ڈھنگ تو دیکھ لیں۔ پرانی دلی برحق۔ تاریخی آثار بجا۔ مگر یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ دلی ثقافت کی سطح پر میر و غالب کے زمانے سے نکل کر اب کن منزلوں میں ہے۔ کل تو دھوبیوں کا آراستہ



کیا ہوا باغ دیکھا تھا۔ اب ذرا نئے ہندوستان کے بھی باغ بغیچے دیکھ لیں۔ نہرو پارک دیکھا۔ بدھ جینتی پارک کو بھی دیکھو۔ واہ واہ سبحان اللہ، پہاڑی کو تراش کر کیا باغ سجایا ہے اور کس انداز سے جہاں تہاں، خاموشی کے منطقے تراشے ہیں۔ تنہائی کے گوشے نکالے ہیں۔ عجب باغ ہے۔ ابھی اردگرد لوگ نظر آ رہے ہیں۔ چہل قدمی کرتے ہوئے، ہنستے بولتے ہوئے اور ابھی جو جھاڑیوں سے ڈھکی ایک روش پر مڑے تو کہاں جا نکلے، جیسے دور کسی سنسان جنگل میں۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ بس ایک مور چہل قدمی کر رہا ہے کہ لمبی گردن اٹھا کر اجنبی نظروں سے آنے والے کو دیکھا اور خاموشی سے ٹہلتا آگے نکل گیا، اور بس اڑنچھو ہو گیا۔ اس عالم میں کتنا جی چاہتا ہے کہ یہیں کہیں کوئی گھنا برگد ہو۔ پیراسن مار کے، دم بند کر کے آنکھیں موند کے اس کی چھاؤں تلے بیٹھ جائیں۔ بیٹھے رہیں۔ پھر جب آنکھ کھولیں تو دیکھیں کہ چاروں اور بوگن ویلیا اپنی پوری لالی کے ساتھ دہکا ہوا ہے اور ایک مور دم پھیلائے ناچ رہا ہے۔ ناچتے ناچتے پرشانت مورتی بن گیا ہے۔ نروان اور کسے کہیں گے۔

بدھ جینتی پارک دیکھ لیا۔ اب شری رام سنٹر چلتے ہیں۔ یہاں الگ قسم کا چمن مہکا ہوا ہے۔ بس یہ پورا علاقہ کلچرل کمپلیکس ہے۔ کمانیہ آڈیٹوریم میں شامیں کتنی آباد رہتی ہیں کسی شام محفلِ موسیقی، کسی شام رقص کی تقریب، کسی شام ڈرامہ۔ اور تروینی آرٹ گیلری کیا خوب جگہ ہے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت سا چائے خانہ جہاں آرٹسٹ چائے پیتے گپ بازی کرتے نظر آ رہے تھے۔ چائے خانے سے قدم باہر رکھا تو ایک مختصر سا اوپن ائیر تھیٹر نظر آیا۔ سٹیج پہ بیٹھے کچھ موسیقار ٹن ٹن کر رہے تھے۔ شام پڑے گی تو موسیقی کی محفل آراستہ ہو گی۔ شائقین جمع ہوں گے۔ اردگرد چھوٹے بڑے ایوان، ہر ایوان میں مصوری کی کوئی نمائش سجی ہوئی۔ پتہ چلا کہ ان ایوانوں میں اس وقت کل ملا کر مصوری کی پندرہ نمائشیں سجی ہیں۔

"ایک وقت میں پندرہ نمائشیں؟" میں تو حیران رہ گیا۔

"جی ہاں۔ یہ بہار کے دن ہیں۔ ہولی کی رت ہے۔ نمائشوں کا موسم ہے۔"

"اور یہ بی بی جن کی تصویریں اس ایوان میں آراستہ ہیں، کون ہیں؟"

"ہاں ہاں۔ یہ کھڑی ہیں۔ آیئے ان سے ملئے۔"

کشمیر کی ایک مسلمان خاتون۔ وہاں کی نامور مصورہ۔

"اور برآمدے میں جو ایک بزرگ بھٹک رہے ہیں۔ پستہ قد، سر سفید، ملا دلا لباس یہ کون ہیں؟"

"ان سے ملئے۔ یہ غلام رسول سنتوش ہیں۔"

"جی ہاں نام سنا تھا۔ اب صورت بھی دیکھ لی۔"

چلو تروینی آرٹ گیلری کی ایک جھلک دیکھ لی۔ مگر میں تو یہاں اس لئے آیا ہوں کہ "قومی آواز" کی نمائندہ نور جہاں ثروت یہاں کسی گوشے میں بیٹھ کر میرا انٹرویو کریں گی تو لیجیئے۔ اوپن ایئر تھیئٹر میں سامنے ٹن ٹن ہو رہی ہے۔ ہم گھاس پر بیٹھ کر ہم کلام ہوتے ہیں مگر یہ بی بی نور جہاں ثروت انٹرویو میں خلوت کی بہت قائل نظر آتی ہیں۔ شمس الحق عثمانی آگئے تھے۔ انہیں روانہ کر دیا کہ میں تمہارے سامنے سوال نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا کہ پتہ نہیں کس ڈھب کے سوال کرنے کی نیت رکھتی ہیں۔ مگر جب انٹرویو ہو چکا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شمس الحق عثمانی کو خواہ مخواہ ہی رخصت کیا تھا۔ لیکن اب وہ آن پہنچے ہیں۔ نارنگ صاحب بھی، منورما بھابی بھی۔ اور ہاں نیس مرزا جو آج دوپہر سے میری خاطر کشٹ کھینچ رہے ہیں اور اس وقت چائے سے تواضع کر رہے ہیں۔ خوب آدمی ہیں۔ جب ابھی کل پرسوں ہم کمانیہ آڈیٹوریم ہی کے آس پاس کسی کھلی جگہ میں ہولی کے رقص دیکھ رہے تھے تو راوی صاحب پردے کے پیچھے سے گاڑھی ہندی بول رہے تھے اور سنسکرت میں اشلوک پڑھتے جاتے تھے۔ نارنگ صاحب نے میرے کان میں کہا:

'یہ نیس مرزا کی آواز ہے'۔

میں نے نیس مرزا کو داد دی کہ ماشاءاللہ آپکو سنسکرت پر خوب عبور ہے۔ بولے:



"کیسا عبور۔ بس بیگم سے کچھ سبق رٹ لئے ہیں"۔

تو یہ ہے دلی کا نیا کلچر۔ جا بجا کلچرل ادارے، آرٹ گیلریاں، تھیئٹر۔ ذرا نمائش گاہ چل کر دیکھو۔ رنگ رنگ کے ایوان۔ ان کے ساتھ تین تھیئٹر ہال۔ ایک اوپن ایئر تھیئٹر۔ دو چھتوں والے۔ ایک شکنتلم تھیئٹر۔ ایک فلک نما تھیئٹر۔ یہ ہے اصل میں نئی دلی۔ یہاں میر و غالب کی دلی کو مت تلاش کرو۔ اب نہ وہ دلی نہ وہ دلی والے۔ نہ وہ بولی ٹھولی نہ وہ کوچہ و بازار۔ اگر ہیں بھی کہیں کونوں کھدروں میں تو بکھری ہوئی حالت میں۔ ع

اب یاں کی زمیں اور فلک، اور ہوا

مگر اردو کو دیکھو کہ اس نئے زمین و آسمان کے بیچ بھی اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ دلی کے اس نئے کلچرل کمپلیکس میں 'تغلق' اپنی فارسی آمیز اردو میں بار بار سٹیج ہوتا ہے اور رش لیتا ہے۔ میں نے بھی دیکھا۔ دوستوں نے اصرار جو کیا تھا کہ موقع ملے تو کسی نہ کسی طور وقت نکال کر القاضی کا 'تغلق' دیکھ لینا۔ سو دیکھ لیا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ بالکل اسلامی تاریخی ڈرامہ۔ مگر ہمارے یہاں کے اسلامی تاریخی ناولوں اور اسلامی تاریخی ٹی وی ڈراموں اور سیریز سے کس قدر مختلف۔ اذان، نماز، تلاوتِ قرآن، یہ سارے اہتمام ڈرامے میں موجود ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہاں اس مذہبی روایت کو چالو سکے کے طور پر تو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس تہذیبی فضا میں یہ مذہبی روایت سکہ رائج الوقت نہیں بن سکتی وہ تو اسی صورت قابلِ قبول ہوگی کہ ڈرامے کی معنویت میں اضافہ کرتی نظر آئے۔ یہاں ٹی وی کے ڈرامہ نگار اپنے ڈراموں میں پوری پوری اذان دیتے ہیں مگر یہ مجھے 'تغلق' دیکھ کر پتہ چلا کہ ڈرامے میں اذان سے کتنے معنی اور کتنا اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ہاں اسے خالی اسلامی تاریخی ڈرامہ مت جانئے۔ ڈرامہ نگار کو تغلق کے ہندوستان اور پنڈت نہرو کے ہندوستان میں ایک مشابہت نظر آئی ہے۔ اس واسطے سے تغلق کا المیہ خالی تغلق کا المیہ نہیں رہا۔ اس میں ایک نئی معنویت پیدا ہوتی دکھائی پڑتی ہے۔

تب میں نے سوچا کہ اردو میں ڈرامہ کے انبار تو ٹی وی کے طفیل پاکستان میں لگ رہے ہیں مگر اردو نئے ڈرامے سے آشنائی دلی میں حاصل کر رہی ہے۔ القاضی نے اردو کے اور ڈرامے بھی سٹیج کئے ہیں۔ یہ ترجمے ہیں، کوئی یونانی ڈرامے سے، کوئی شکسپیر سے "تغلق" کنڑی سے ترجمہ ہے اور ترجمہ کرنے والے اردو کے معروف ادیب نہیں ہیں بس القاضی کے گروپ ہی کے افراد ہیں۔ تو غریب اردو میر و غالب کی دلی سے نکل کر نئی دلی میں آ کر نئے تہذیبی اور لسانی مرکب میں کسی نہ کسی راستے اثر و نفوذ پیدا کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ فلم کے راستے، موسیقی کے راستے، ڈرامے کے راستے۔ مگر غریب اپنے رسم الخط کی وجہ سے مار کھا رہی ہے ورنہ اثر و نفوذ بہت نظر آتا ہے۔

غالب کا حوالہ بیچ میں آ ہی گیا ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ غالب کے مزار پہ گیا مگر اسے اچھے حال میں نہیں پایا۔ آگے تو میں نے اس نئے تعمیر شدہ مزار اور اس کے چبوترے کو بہت کیسے صاف شفاف دیکھا تھا مگر اس مرتبہ وہاں گیا تو چبوترے کو گرد آلود پایا۔ گداگروں کو ڈیرا کئے دیکھا۔

ذہین نقوی صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ان سے پوچھا:

"کیوں صاحب۔ اب غالب کے مزار کی دیکھ بھال نہیں ہوتی؟"

انہوں نے سارا الزام محکمہ آثار قدیمہ کے سر ڈال دیا۔ ویسے صفائی کے لئے یہ پورا کوچہ ہی توجہ کا محتاج ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ بھی تو اسی کوچے میں ہے اور اس درگاہ کے مجاور اور منتظمین بھی شاید صفائی کے لئے زیادہ تردد کے قائل نہیں۔

غالب کے مزار کا ذکر آیا ہے تو لیجئے مجھے ایک ننھا سا مزار اور یاد آ گیا۔ ویسے اسے یاد آنا چاہئے تھا میر کے واسطے سے۔ میں نے ابھی ابھی لاہور سے چلتے چلتے میر کی بلیوں کا تذکرہ پڑھ کر ختم کیا تھا۔ میر کے بلی کتوں پر مضمون جو باندھنا تھا۔ اس پس منظر کے ساتھ جب میں شمیم حنفی کے یہاں پہنچا تو وہ بلی جسے میں پچھلے پھیرے میں اس گھر میں دیکھ کر گیا تھا بے طرح یاد آئی میر



کے گھر میں جو چند ناسی بلیاں موہنی اور سوہنی تھیں یہ بلی بھی انہیں میں سے کسی کی آل اولاد معلوم ہوتی تھی۔ مگر وہ انتقال کر چکی تھی۔ سیمیں اور غزل نے دکھے دل سے اس کے گزر جانے کا احوال بیان کیا۔ بتایا کہ ہم نے اس کی قبر بنائی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ ؎

تو بھی تقریب، فاتحہ کو چل

بخدا واجب الزیارت ہے

ہماری ڈبائی میں ایک ہاتھی کی قبر تھی۔ پتہ نہیں کس بندۂ خدا نے بنائی تھی۔ کتنے اچھے ہوتے ہیں وہ لوگ، جو جانوروں کو آدمی جانتے ہیں۔ ان کے مرنے پر ان کا سوگ کرتے ہیں۔ ان کی تکفین و تدفین کرتے ہیں۔ ان کی بخشش کیلئے دعا کرتے ہیں۔

لو مجھے تو آج دلی سے لکھنؤ جانا ہے۔ میں کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ ابھی تروینی سے نکلوں گا تو پنجابی دوستوں کی محفل میں حاضری دوں گا۔ پنجابی کے دوستوں نے وعدہ لے لیا تھا کہ ہماری طرف آنا ہے۔ سو میں ان کی طرف پہنچا۔ کتنی جانی پہچانی صورتیں یہاں نظر آئیں۔ وہی جن کے ساتھ میں لاہور میں ضیغم البھاکری کے وسیلہ سے مل بیٹھ چکا تھا۔ مگر عجب بات ہے کہ جب اجیت کور جی کے گھر دعوت پر گیا تو وہاں ان لیکھکوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ وہاں دوسرے ہی لیکھک جمع تھے۔ سب سے بڑھ کر امرتا پریتم، سندھوجی، جو فیض صاحب کی مدح کرتے ہوئے تھکتے میں نہیں آ رہے تھے۔ اور ہاں ـــــ اپنیتا سنگھ! کیا اجلی اجلی خاتون تھیں کتنے اصرار سے کہا تھا کہ ہمارے گھر نہیں آنا ہے۔ مقرر آؤں گا۔ مگر نہیں گیا۔ ایک طرف یہ غم کہ ہائے کیسی اچھی دعوت چھوڑ دی۔ دوسری طرف منیر شیخ سے باز پرس کا اندیشہ۔ کرتا کیا۔ وقت تھا کہ اڑا چلا جا رہا تھا۔ شاید نہیں کہ ہاتھوں سے نکلتی چلی جا رہی تھیں۔ کس عجلت میں تروینی سے نکل کر بھاگتا دوڑتا پنجابی دوستوں کی محفل میں پہنچا ہوں۔ جلدی کا کام شیطان کا مگر شیطان بننا ہی پڑے گا۔ لکھنؤ کی گاڑی بھی تو پکڑنی ہے۔ تو پنجابی دوستوں سے افسانے سنے۔ اپنا افسانہ سنایا۔ داد دی، داد لی۔ اور بھاگا وہاں سے سر پہ

پاؤں رکھ کر۔ حبیب سنگھ چار قدم ساتھ چلے۔ تھک کر پیچھے رہ گئے۔ نارنگ صاحب آگے آگے ہیں پیچھے پیچھے۔

اے بھئی نارنگ صاحب پہلے تو روانگی کا اندراج کرانا ہے۔ وہ بھی کرائے لیتے ہیں۔ تو پہلے پولیس کے دفتر۔ پھر بگنٹ سٹیشن کی طرف۔ لکھنؤ جانے والی گاڑی تیار ہے۔ جمیل جالبی اور بیگم جالبی بھی آن پہنچے ہیں۔ میں، میری بیگم۔ ہم چاروں کو مل کر لکھنؤ جانا ہے۔

جمیل جالبی پھولے پھولے نظر آرہے ہیں۔ پھولے پھولے کیوں نظر نہیں آئیں گے حیدرآباد کو لوٹ کر لوٹے ہیں۔ پھولے ہوئے ہیں اور مہک رہے ہیں۔ گیندے کے گجرے کی مہک تو جلدی ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ جمیل جالبی کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں میرے گلے میں صندل کی لکڑی کے ترشے ہوئے پھولوں کے بھی دو ہار ڈالے گئے۔ تو گویا یہ صندل کی مہک ہے۔

گاڑی چل پڑی۔ چھک چھک، چھک چھک۔ دوستو! ہم لکھنؤ جا رہے ہیں۔ رات بھر چلیں گے۔ صبح کو لکھنؤ پہنچیں گے۔ سنڈیلہ، کاکوری، ملیح آباد، منہ اندھیرے کیسا کیسا سٹیشن آیا اور گزر گیا۔



آگیا، لکھنؤ آگیا۔ علی جواد زیدی، صباح الدین عمر، انیس اشفاق۔ دیکھو کیسے کیسے دوست کیسے کیسے بزرگ ہمیں لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ دیکھا تھا۔ دوسری دفعہ دیکھنے کی آرزو تھی۔ آرزو پوری ہوئی۔ میں پھر لکھنؤ میں ہوں۔ تقریبیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ کوچے اپنی طرف بلاتے ہیں۔ تقریبیں برحق، ملاقاتیں جائز، دعوتیں نیکی اور پوچھ پوچھ۔ مگر اس ساری سرگرمی میں معنی تو اسی وقت پیدا ہوں گے جب اس دیار کے کوچوں سے ملاقات ہوگی۔ اے لو گول دروازہ آ گیا۔ یہاں سے چوک شروع ہوتا ہے۔ چوک۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ دکانیں صاف شفاف صراف کے مقابل صراف۔ ان کے جھلمل کرتے، خوش نما صدریاں، دودھیا سی دھوتیاں، جگر جگر کرتے زیور، چمک دمک دکھاتے کامدانی اور کار چوب کے نمونے، ہزاری بزاری ایک ہجوم خریداروں کا، ایک بھیڑ دید بازوں کی، اہلے گہلے پھرتے ہیں۔ قدم زمین پر نظر بالا خانوں پر۔ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں کہ شرفا بھی اس کوچے میں سے گزرتے ہوئے انہیں ایک نظر ضرور دیکھتے ہیں۔ کوچہ کیا شاد آباد ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ کٹورا بجتا ہے۔ ساقی حقہ لئے پھرتے ہیں۔ خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھتی ہیں جیسے سارا چوک عطر میں بسا ہو۔ اور لیجئے اب اور ہی طرح کی خوشبوؤں کی لپٹیں آنے لگی ہیں کہ زبان اور تالو کے

بیچ کیسے کیسے ذائقے بھر بھرانے لگتے ہیں۔ ہوائی چپاتیاں، ورقی پراٹھے اٹھارہ ورق والے پستہ بادام کی تہ دی ہوئی پوریاں، انناس والا مزعفر، نارنجی زردہ، شش رنگا، یاقوتی مٹی کی ورقی ہنڈیوں میں لگی ہوئی ـــــ مگر میری آنکھیں میرے ساتھ دغا کرتی ہیں۔ انہیں نقشہ اور نظر آتا ہے۔ اے نادان، اپنی آنکھوں پر اعتبار کر۔ تو کونسے چوک کا تصور لیکر یہاں آیا ہے۔ وہ چوک جنہوں نے دیکھا ان کے لئے اب خواب ہے۔ جنہوں نے سنا انکے لئے افسانہ ہے۔ نہ وہ رنگ نہ وہ ذائقے نہ وہ خوشبوئیں نہ وہ پری چہرہ لوگ نہ وہ نگہ سرمہ سا۔ بالاخانے ویران ہیں۔ ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

چوک اس سب کے باوجود چوک ہے۔ وہ دم بند کرنے والی بے ہنگم بھیڑ جو ہندوستان میں شہر شہر بڑے بازاروں میں نظر آتی ہے یہاں نہیں ہے۔ عجب سکون کی فضا ہے اس بازار میں۔ گہما گہمی ہے۔ بھیڑ نہیں ہے۔ دکانیں اب بھی صاف شفاف ہیں۔ جھل جھل کرتے صدریاں نظر نہیں آئیں مگر دودھ جیسی دھوتیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ چاندنی نفاست سے بچھی ہوئی، دکاندار سلیقہ سے بیٹھے ہوئے، پارچہ فروش، چھاپے والے، ورق گر، بزاز، صراف، جوہری، عطار اور پھر کھانے پینے کی دکانیں۔ میں اچانک ٹھٹکتا ہوں:

"یار۔ یہاں جو انناس والا مزعفر ملتا ہے . . . ."

"انناس والا مزعفر؟"

"ہاں یار۔ یہاں کوئی حیدر حسن خاں کا پھاٹک ہے اس کے متصل گلی میں مزعفر کی دکان ہے جہاں انناس والا مزعفر ملتا ہے"۔

"انتظار صاحب۔ آپ کب کی باتیں کر رہے ہیں۔ اب یہاں ایسی کوئی دکان نہیں ہے"۔

صباح الدین عمر جو ہمارے ساتھ ہیں خوب بزرگ ہیں۔ پوری لکھنؤ کی تاریخ جیسے



انہیں از بر ہے مگر انناس والے مزعفر سے انہیں کوئی رغبت نہیں۔ ان کے لئے اگر کہیں کشش ہے تو ان چہروں میں جواب گم ہو چکے ہیں۔ اجڑے بالاخانوں کا ذکر کس دکھ سے کر رہے ہیں اور گمشدہ ڈیرہ دارنیوں کی باتیں کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں کتنی چمک پیدا ہو گئی ہے۔

ایک عالی شان عمارت کو دیکھ کر میں ٹھٹکتا ہوں:

"اچھا۔ یہ ہے اصغر محمد علی تاجران عطر کا ٹھکانا"۔

"جی ہاں جی ہاں۔ یہاں پہلے چودھرائن رہا کرتی تھی"۔

"چودھرائن؟"

"جی چودھرائن۔ ارے صاحب کیا بات تھی چودھرائن کی"۔

صباح الدین عمر رواں ہو جاتے ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ اس شہر کے سب بزرگوں کے تصور میں چودھرائن بسی ہوئی ہے کہ صباح الدین عمر کو سنیں تو چودھرائن کی سج دھج کا تذکرہ اور مرزا جعفر حسین کا تذکرہ "لکھنؤ" پڑھیں تو چودھرائن کی آن بان کا بیان۔ رفتہ رفتہ میں بھی ان کے اثر میں آجاتا ہوں۔ انناس کے مزعفر کو بھولتا ہوں اور چودھرائن اپنی سج دھج کے ساتھ تصور میں سماتی چلی جاتی ہے۔ بڑی چودھرائن، چھوٹی چودھرائن، مہر منیر، ماہ منیر، رشک منیر۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ کیا شان ہے اس گھر کی۔ ایک گوشے میں امام باڑہ دوسرے کسی گوشے میں شرفا کے صاحبزادگان جوق در جوق آتے دکھائی دیں گے۔ تہذیب بھی سیکھ رہے ہیں اور اخلاقِ حسنہ کا درس بھی لے رہے ہیں، اور وہ ایوان جہاں شرفائے روسا چودھرائنوں کے پروانے بنے بیٹھے ہیں۔ دور دور سے باتیں ہوتی ہیں۔ قرب یہاں کہاں میسر ہے۔ پروانوں کی عمریں گزر گئیں مگر حجابات اسی طرح قائم ہیں۔ اسی طرح آنا اور فاصلے سے بیٹھنا ؎

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے　　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مگر وقت تیزی سے گزر رہا ہے، بدل رہا ہے۔ چودھرائن کی عمر ڈھلتی جا رہی ہے اور لکھنؤ کے رؤسا شرفا کا اقبال گہنا رہا ہے۔ تعلقہ داروں کے ٹھاٹ باٹ ختم ہو رہے ہیں۔ چودھرائن کی محفل میں درہمی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مگر وہی ٹھسا وہی اللّے تللّے حویلی رہن رکھی جاتی ہے۔ اب اس حویلی سے ایک خوشبو رخصت ہو رہی ہے دوسری خوشبو آ رہی ہے۔ ڈیرہ دارنیاں گئیں۔ چودھرائن، بڑی چودھرائن، چھوٹی چودھرائن، گھرانے کی آخری کلی رشک منیر، سب چہک مہک کر رخصت ہوئیں۔ اب اصغر علی محمد علی اپنی خوشبوئیں لے کر یہاں براجمان ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ خوشبو نہ رہی تو یہ خوشبو کیسے رہ جائے گی۔ عطریات کا زمانہ بھی تو وہی تھا۔ اصغر علی محمد علی کے عطر تھوڑے عرصے خوب چلے۔ مگر اب یہ عمارت مقفل پڑی ہے۔ پہلے وہ جو مہکتے تھے اور دردانے دل کھینچتے تھے رخصت ہوئے۔ اب وہ بھی جن کے عطر کی مہک دور دور تک گئی تھی یہاں نظر نہیں آتے۔

"کیا ہوا اصغر علی محمد علی کے کارخانے کو؟"

"بس ان کی اولاد میں جائداد کا جھگڑا اٹھ گیا۔ کارخانہ بند ہو گیا۔"

لیجیے یہ خوشبو بھی گئی۔ اللہ بس باقی ہوس۔

"دیکھیے یہ تحسین خاں کی مسجد ہے۔"

اصغر علی محمد علی کا کارخانہ پیچھے رہ گیا ہے۔ صباح الدین عمر اب ہمیں ایک پرانی مسجد سے متعارف کرا رہے ہیں۔

"تحسین خاں کی مسجد؟" میرے کان کھڑے ہوتے ہیں۔

"جی۔ تحسین خاں کی مسجد۔"

"ارے بھئی جمیل جالبی۔ یہ وہی مسجد تو نہیں جس کا ذکر 'آب حیات' میں میر صاحب کے باب میں آتا ہے۔"

اور جمیل جالبی اپنے محقق والے اعتماد سے جواب دیتے ہیں۔ "ہاں یہ وہی مسجد ہے۔"



تو یہ ہے تحسین خاں والی مسجد۔ گزرنا اس راہ سے نواب کی سواری کا۔ سواری بادبہاری، ہاتھی پر عماری، عماری میں بیٹھے ہوئے نواب سعادت علی خاں۔ پہنچنا برابر میں مسجد تحسین خاں کے۔ کھڑے ہو جانا سیڑھیوں پہ بیٹھے معززین کا اور بجا لانا آداب کا سوائے ایک شخص کے کہ اپنے ٹھسے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے۔

"انشاء اللہ خاں، یہ کون شخص تھا جس کی تمکنت نے اسے اتنی اجازت نہ دی کہ کھڑے ہو کر دو پورے سلام کے لئے اٹھا لیتا"۔

"جناب عالی۔ یہ وہی گدائے متکبر میر تقی میر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال، مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقے ہی سے ہوگا"۔

مسجد تحسین خاں اب وہ مسجد تحسین خاں نہیں۔ اب اس کی سیڑھیوں پہ کوئی ٹھسے والا شاعر آ کر نہیں بیٹھتا اور اس راہ سے کوئی ہاتھی کی سواری نہیں گزرتی۔ ہاتھی کی سواری اب لکھنؤ میں کہاں۔ یہ موٹروں کا عہد ہے۔ ہاتھیوں کا عہد گزر چکا۔ ہاتھی کی سواری دیکھنی ہی ہے تو جے پور جاؤ اور دیکھو کہ وہاں قلعہ کی سیر کو جانے والے کس بے تکلفی سے ایک ایک روپیہ ادا کر کے فیل سوار بن جاتے ہیں اور محلات کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے ہاتھی کے حال پہ ایک افسوس اس وقت کیا تھا جب دلی میں جامع مسجد اور لال قلعہ کے بیچ ایک ہاتھی کو لکھنؤ کے کرتوں کا اشتہاری بنے دیکھا تھا۔ ایک افسوس اس وقت کیا جب جے پور کے قلعہ میں ہاتھیوں کو ایرا غیرا سواریوں کو ڈھوتے دیکھا۔ ہندوستان ترقی کر رہا ہے مگر ہندوستان کے ہاتھی پہ زوال آ چکا ہے۔

ایک ہاتھی پر کیا موقوف ہے، لکھنؤ رفتہ رفتہ اپنی سب روایتی سواریوں سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ نہ گھوڑا گاڑی نہ جو بہلا، نہ فینس نہ ڈولی، نہ شکرم نہ ٹم ٹم۔ اور مجھے تو اِکہ بھی مشکل ہی سے نظر آیا۔ اس کی جگہ رکشا نے لے لی ہے۔ میری دقت یہ ہے کہ میں اِن رنگوں اور ذائقوں کو تصور میں بسا کر لکھنؤ میں آیا ہوں جن سے لکھنؤ عبارت رہا ہے

مگر میرے پہنچتے پہنچتے لکھنؤ نے اپنے سارے ذائقے سارے رنگ گم کر دیئے۔ کوئی نیا ذائقہ، نیا رنگ؟ دیکھئے صاحب! لکھنؤ دلی تو ہے نہیں۔ دلی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا۔ لٹا اور پھر آباد ہو گیا۔ حشر بپا ہوا، بربادی ہوئی اور پھر اس خاکستر سے ایک نئی دلی پھوٹ پڑی۔ اس وقت بھی دلی میں دو دلیاں سانس لے رہی ہیں۔ نئی دلی اور پرانی دلی شاہجہاں والی۔ مگر لکھنؤ ایک ہے۔ اس نے آباد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وضع پکڑی تھی۔ ایک تہذیب کی صورت لی تھی۔ اس وضع، اس صورت میں وہ رچی بسی آئی سو آئی۔ اگر لکھنؤ میں نئی صورتیں، نئی وضعیں راہ بھی پا رہی ہیں تو زمانے کے جبر سے راہ پا رہی ہیں۔ اس جبر سے کوئی نیا لکھنؤ پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ لکھنؤ آہستہ آہستہ ڈھے رہا ہے۔

"آپ فرنگی محل چلیں گے۔ بس یہاں سے فرنگی محل شروع ہو گیا ہے"۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ فرنگی محل کیوں نہیں چلیں گے۔ نام سنا ہے فرنگی محل کا۔ فرنگی محل دیکھیں گے اور علماء کو بھی دیکھیں گے کہ وہ کیسے ہوتے ہیں۔ پاکستان کے علماء کی طرح کے تو یقیناً نہیں ہوں گے"۔

"علماء!" عبدالرب کہتے ہیں۔ "اچھا آپ مولانا عبدالباری کا مکان دیکھ لیجئے"۔

"بالکل دکھایئے۔ مولانا عبدالباری کا مکان دیکھ لیا تو گویا پورا فرنگی محل دیکھ لیا"۔

اور ہم چلتے چلتے ایک ڈیوڑھی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ میں، جمیل جالبی اور بیگم جالبی ہماری بھابی جنہیں ایک خاتون بڑھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں۔ اور اب پتہ چلا کہ عبدالرب جو ہمارے ساتھ مسکین بنے چل رہے تھے اصل میں اس گھر کے داماد ہیں جب ہی تو ہم نے اس گھر کو اندر باہر سے اتنی تفصیل کے ساتھ دیکھ لیا جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ ڈیوڑھی، اس سے آگے ایک صحن، صحن کے ارد گرد کچھ کوٹھڑیاں، ایک برآمدہ۔ یہ مردانہ ہے۔ برآمدے میں چاندنی بچھی ہے۔ گاؤ تکیہ لگا ہے۔ ایک بزرگ اندر سے تشریف



لاتے ہیں۔ برآمدے میں لے جاتے ہیں:

"تشریف رکھئے"۔

ہم بیٹھ جاتے ہیں۔

"دیکھئے یہ سامنے جو نظر آ رہا ہے یہ تہ خانہ ہے۔ یہاں تحریکِ خلافت کی پہلی میٹنگ ہوئی تھی۔ وہ خفیہ میٹنگ تھی اس لئے تہ خانے میں ہوئی تھی"۔

تحریکِ خلافت کی پہلی میٹنگ، خفیہ میٹنگ۔ اچھا؟ کون کون بزرگ اس میں شریک ہوتے ہوں گے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری۔ حکیم اجمل خاں اور؟

"اور دیکھئے۔ یہ جو سامنے کوٹھڑی ہے یہاں آ کر گاندھی جی ٹھہرا کرتے تھے۔ آیئے اس کوٹھڑی کو دیکھئے"۔

"یہ کوٹھڑی تو بہت چھوٹی ہے" میں حیران رہ جاتا ہوں۔ "گاندھی جی اس میں ٹھہرا کرتے تھے؟"

"جی!"

پھر مجھے اچانک یاد آتا ہے کہ گاندھی جی اکیلے تو نہیں ہوا کرتے تھے۔

"قبلہ ایک بات بتلایئے۔ گاندھی جی کے ساتھ ان کی بکری بھی تو ہوتی تھی۔ وہ غریب بھی اسی کوٹھڑی میں ....."

"نہیں نہیں" بزرگ نے فوراً بات کاٹی۔ "وہ الگ بندھتی تھی۔ وہ بھی ایک خاص جگہ تھی"۔

"وہ خاص جگہ کونسی تھی؟"

بزرگ نے جواب میں ٹھنڈا سانس لیا۔ بتایا کہ وہ جگہ تجاوزات کی زد میں آ گئی۔

افسوس ___ !

بزرگ ہمیں ایک چھوٹے سے دروازے سے گزارتے ہیں اور اندر لے جاتے ہیں۔ ایک اور گھر شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کے اندر سے ایک اور گھر میں جا نکلتے ہیں۔ کمال ہے۔ باہر سے دیکھنے پر یہ چھوٹا سا گھر ہے مگر یہ تو مکان در مکان ہے۔

اچھا اب فرنگی محل سے نکلیں۔ لنچ پہ ہماری ڈھونڈیا پڑ رہی ہوگی۔ وہاں سے بھاگم بھاگ جلسہ میں پہنچنا ہے۔ اور ہاں بیچ میں ایک لنچ اور بھی تو لگ گئی ہے۔ مہمان تو ہم اتر پردیش اکیڈمی کے ہیں جس کے چیئرمین محمود الٰہی صاحب اور سیکرٹری علی جواد زیدی صاحب ہیں۔ انہوں نے ہی ہماری صبحیں، دوپہریں، شامیں بطریق احسن صرفے میں لانے کی صورتیں سوچی ہیں اور پروگرام بنایا ہے مگر بیچ بیچ میں دوسری صورتیں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ مسلمان خواتین کی ایک انجمن جو اس شہر میں بہت سرگرم ہے تقاضے پہ تقاضے کر رہی ہے کہ ہماری محفل میں بھی آؤ۔ خواتین کا کہنا کون ٹال سکتا ہے۔ سو ہمیں ان کے ہاں بھی جانا ہی تھا۔ ویسے اس شہر میں مسلمان خواتین کچھ زیادہ ہی سرگرم نظر آتی ہیں۔ کوئی اسمبلی میں چہک رہی ہے۔ کوئی ادب میں رواں دواں ہے اور یوں نہیں کہ غزل کہہ لی اور مشاعرہ لوٹ لیا۔ دو تو پی۔ ایچ۔ ڈی نظر آئیں۔ ڈاکٹر صبیحہ انور اپنی تصنیف "اردو میں خود نوشت سوانح حیات" کے ساتھ اور ڈاکٹر صفیہ پروین اپنی تصنیف "اصغر گونڈوی، حیات اور شاعری" کے ساتھ۔ مسرور جہاں ڈاکٹر نہ بن سکیں تو افسانے کی راہ پہ چل پڑیں۔ میں نے ان کی انجمن کے بیچ ایک بی بی سے پوچھا کہ:

"آپ نے اپنی سرگرمیوں کے متعلق یہ بھی سوچا کہ وہ اسلام کی رُو سے بھی جائز ہیں یا نہیں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ کسی مولوی صاحب نے آپ کی ان سرگرمیوں کے متعلق کوئی فتوےٰ تو نہیں دیا ابھی تک"۔



"جی نہیں۔ ایسے فتوے پاکستان میں جاری ہوتے ہیں۔ ہمارے لکھنؤ کے علمائے دین عورتوں کی بہبودی کے دشمن نہیں ہیں"۔

لیجئے۔ بیچ میں ہندی کے لیکھک بھی ٹپک پڑے۔ زیدی صاحب نے اطلاع دی کہ بھئی ہندی ادیبوں کا ایک گروپ "نوچیتن" ہے۔ وہ آپ لوگوں کے ساتھ ایک محفل کرنا چاہتا ہے، مگر ان میں صحافی بھی ہوں گے۔ میں نے ان سے کہہ تو دیا ہے کہ سوالات صرف ادب کی حد تک ہونے چاہئیں۔

زیدی صاحب بھی کیا بھولے بزرگ ہیں۔ اخبار نویس اگر زد میں آئے ہوئے شکار کو یوں کسی کے کہنے پر چھوڑ دیا کریں تو کر چکے اخبار نویسی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ جگ جگ آئیں۔ جگ جگ پوچھیں۔ پہلے تو وہ جمیل جالبی سے سوال کرتے رہے اور وہ مردِ محقق تحقیق کی ترازو میں تول تول کر ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ پھر رخ میری طرف ہوا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں اجنبیت کے پردے میں بچ کر نکل جاؤں گا۔ ان انقلابی نوجوانوں کو کیا پتہ ہوگا کہ میں اردو میں کتنی رجعت پسندی بگھارتا ہوں۔ مگر نہیں۔ ہندی کے پرچوں میں جو میرے افسانے جہاں تہاں سے شائع ہوئے تھے اور ان کے ساتھ "بستی" کا ہندی ایڈیشن۔ ان کے پاس اچھا خاصا مسالہ تھا۔ میرے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کیلئے۔ وہ مجھ سے فارغ خطی لکھوانا چاہتے تھے کہ پاکستان کی بند فضا میں کسی نئی فکر کی گنجائش نہیں ہے۔ نئی فکر بمعنی مارکسی فکر۔ میں انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ فکر و خیال کا یہ برانڈ ہمارے ہاں اب بھی ماشاء اللہ سے لشتم پشتم چل رہا ہے۔ جس انقلابی محاورے میں آپ بات کر رہے ہیں اس محاورے میں بولنے والے پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ انقلاب کے دشمنوں اور انقلاب کی راہ میں بچک جانے والے انقلابیوں کے لئے جو القاب و آداب ہندوستان میں مروّج ہیں وہ پاکستان میں بھی سنے جا سکتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو لاہور آؤ اور ٹی ہاؤس میں آکر جھانکو۔ وہاں آکر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے دانشوروں

کے بیچ بھی انقلابی عمل خوب تیز ہے کہ ایک وقت میں انور سجاد اور ان کے آڑی یا وہ اور ان کے آڑی انور سجاد اپنے پیشرو ترقی پسندوں کو موقع پرست کہہ رہے تھے۔ اور دوسرے وقت میں اسی لقب کے ساتھ انور سجاد کافی ہاؤس میں سواگت کیا گیا۔

"انور سجاد کون؟"

"آپ ہمارے انقلابی افسانہ نگار انور سجاد کو نہیں جانتے"۔

"نہیں"۔

اس گھڑی مجھے انور عظیم پر سخت غصہ آیا۔ اس مردِ خدا سے یہ بھی نہ ہوا کہ ہندی والوں کو ذرا بتا دیتا کہ انور سجاد کیا بیچتا ہے۔ ہندی رسالوں کے سب قیمتی صفحے مجھ پر نثار کر دیئے۔ خیر جو پتھر انور عظیم کو ڈھونے تھے وہ میں نے ڈھوئے اور بتایا کہ انور سجاد کے سٹال پر سارا آپ کی پسند کا مال ہے۔ مگر انور سجاد میری ڈھال تو نہیں بن سکتے تھے بس پاکستان کے کام آ سکتے تھے۔ نمونے کے طور پر کہ انقلابی نام کی مخلوق پاکستان میں آج بھی پائی جاتی ہے۔ مجھے اپنے گناہوں کا بوجھ خود ہی اٹھانا تھا۔ سو کومٹ منٹ کا سوال اٹھا اور میری ان کے ساتھ چٹ پٹ ہونے لگی مگر اسی گھڑی ریڈیو سے کے۔ کے۔ نیر کے فرستادگان سر پہ آن کھڑے ہوئے۔ اور منتظمین نے بھی اپنی طرف سے نیکی کی۔ سوچا کہ مہمان ہے۔ جانے دو۔ اور کے۔ کے۔ نیر کے ہلنے برابر برابر یہ چھڑا دی۔

کے۔ کے۔ نیر آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں سے گھوم پھر کر اب بطور ریذیڈنٹ ڈائرکٹر لکھنؤ سٹیشن پہنچے ہیں۔ صحیح پہنچے ہیں۔ ویسے تو انبالے کی مٹی ہیں لیکن اسوقت سے جب میں نے اردو سروس سے ان کے کچھ انٹرویو سنے تھے مجھے ان کے یہاں سے ایک لکھنؤ کی سی مہک آ رہی تھی۔ کس شائستگی سے سوال کرتے ہیں اور کتنا میٹھا اور نرم بولتے ہیں۔ چھپا جانے کی نہیں سوچتے۔ پیٹ میں گھستے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ جو چھپا کر اندر رکھا ہے وہ سب ان کے سامنے نکال کر رکھ دو۔ سو وہ سہج سہج پوچھتے رہے۔ میں سادہ دل



بولتا بتاتا چلا گیا۔ کمک پر انیس اشفاق تھے۔ سونے پر سہاگہ۔

جب ہم تھمے تو انہوں نے گھڑی دیکھی۔ بولے :

"پینیسٹھ منٹ"!

"پینیسٹھ منٹ"! میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ . . . . "یعنی کہ میں پینیسٹھ منٹ بولا ہوں"!

"جی حضرت"!

پٹنہ سٹیشن پہ شمیم فاروقی نے سوچا کہ میں کے۔ کے۔ نیر سے کیوں پیچھے رہوں۔ مورکھ! تجھے ہندوستان میں آ کر کیا ہو گیا۔ وہاں حلقہ ارباب ذوق کی چھوٹی سی نشست میں چار فقرے مربوط نہیں بول سکتا تھا۔ یہاں آ کر پینیسٹھ پینیسٹھ منٹ کی گفتگو اور سٹیج پر تقریریں۔ گیندے کا گجرا گلے میں پڑا اور تُو جاری ہو گیا۔ تیرا افسانہ رہے گا یا جائے گا۔ یہ گیندے کے موٹے موٹے ہار تجھے لے بیٹھیں گے۔ بجا کہا۔ ویسے گیندے کے پھول مجھے اچھے لگتے ہیں مگر شاخوں پر۔ یاد آیا کہ پچھلی بار تو میں شمیم حنفی کے ساتھ مل کر منہ اندھیرے گیندے کے کھیتوں کو کھوند چکا ہوں۔ اوکھلے میں پلیا کے پار آ لہا اودل کے پیڑ سے پرے حدِ نظر تک گیندے کے کھیت۔ جہاں تہاں زرد زرد پھولوں کے بیچ سے ابھرتی ہوئی مور کی نیلی گردن۔ اور یہاں نئی دلی کے بیچ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر۔ مالویکا ادیسی نرت پیش کر رہی ہے۔ ایک گوشے میں سرسوتی کی مورتی رکھی ہے۔ گلے میں گیندے کا ہار۔ گیندے کی پتیاں چرنوں میں بکھری ہوئی۔ ادھر مالویکا کا بسنتی بانا اور اودیسی نرت۔ ادھر گیندے کی بسنت بہار، اس منظر کے بھی معنی سمجھ میں آئے۔ مگر پتہ نہیں سٹیج پر جب مہمانِ خصوصی کے گلے میں گیندے کا ہار ڈالا جاتا ہے تو اس وقت گیندے کو کیا ہو جاتا ہے۔ کہاں چلی جاتی ہے اس کی کشش۔ گیندا، گلاب، موتیا، سب پھول اپنے اپنے رنگ میں بھلے لگتے ہیں۔ لیکن اگر کسی پھول کو آدمی پر سجنا ہے تو اس کے لئے مناسب جگہ عورت کا جوڑا

ہے نہ کہ مرد کا گلا۔ مونیا کے لئے اول عورت کا جوڑا، دوم صراحی کی گردن۔

پھولوں کا ذکر آہی گیا ہے تو مجھے اس گلاب کے پھول کو یاد کر لینے دیجئے جو مجھے امام باڑہ آصف الدولہ میں ایک عزادار نے نذر کیا تھا۔ جمیل جالبی نے بیٹھے بیٹھے کہا:

"تم شاہ نجف ہو آئے۔ میں وہاں نہیں گیا ہوں۔"

"تو شاہ نجف کونسا دور ہے۔ دیوار سے دیوار تو ملی ہوئی ہے۔ کالٹن میں ٹھہرنے کا یہی تو فائدہ ہوا ہے۔ باقی دوستوں نے تو اور فائدے بھی گنائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں کچھ تاریخی شخصیتیں آ کر ٹھہرتی رہی ہیں۔"

"اچھا کل صبح ٹہلنے نکلیں گے۔ بوٹنی گارڈن جائیں گے کہ وہ بھی تو سامنے ہی ہے۔ وہاں سے واپسی میں شاہ نجف چلیں گے۔"

"ضرور چلیں اور دیکھیں کہ نواب غازی الدین حیدر نے لکھنؤ میں نجف کا نقش کیسے قائم کیا ہے۔"

شاہ نجف۔ پھر بڑا امام باڑہ۔ پھر چھوٹا امام باڑہ۔ بڑا امام باڑہ۔ جس کو نہ دیں مولا اس کو دیں آصف الدولہ ــــ کال پڑا تو اس رعایا پرور نواب نے امام باڑہ بنوانا شروع کر دیا۔ بس اینٹ اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھے جاؤ۔ اور اجرت لے جاؤ۔ اور اب جمیل جالبی کہہ رہے تھے کہ یہ عمارت اودھ کی تہذیب کا نقطۂ عروج ہے۔

"صاحب یہ بیچ کی بڑی چھت جو آپ دیکھتے ہیں یہ ایک ٹرے ہے۔"

"ٹرے؟"

"جی ہاں ٹرے۔ بائیں طرف کی چھت کو دیکھئے۔ یہ خربوزہ ہے۔ دائیں طرف کی چھت پر نظر ڈالئے۔ یہ رکابی ہے۔"

"خربوزہ، رکابی، ٹرے۔ خوب، اچھا ان چھتوں کے اوپر کیا ہے۔"

"بھول بھلیاں۔"



جمیل جالبی بھول بھلیاں دیکھنے کے شوق میں سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ بھیا میں تو چھت کی طرف نکلنے والے دروازے سے نکل چھت پہ جا بیٹھا۔ جمیل جالبی اپنی بیگم کا ہاتھ ہاتھ میں لئے قافلہ کے جلو میں بھول بھلیاں میں گھومتے پھر رہے ہیں۔ میں اکیلا چھت پہ ہوں۔ اس چھت کا اپنا ایک سحر ہے۔ اودھ کی تہذیب کا نقطۂ عروج۔ مگر نقطۂ عروج مائل بہ زوال ہے۔ در و دیوار کی، کنگروں کی، گنبدوں کی حالت خستہ ہے۔

"کب سے اس عمارت کی مرمت نہیں ہوئی۔" میں نے ایک بھٹکتے ہوئے عزادار سے پوچھا۔

"صاحب۔ عمارت کی دیکھ بھال تو حکومت نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ دس دنوں کے لئے ہمیں ملتی ہے۔ سو ان دنوں میں حسین آباد ٹرسٹ یہاں عزاداری کا اہتمام کرتا ہے۔"

"حسین آباد ٹرسٹ امام باڑے کی مرمت پر توجہ کیوں نہیں کرتا۔"

"اس امام باڑے کی مرمت کیلئے زرِ کثیر کی ضرورت ہے۔ حسین آباد ٹرسٹ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ کام تو محکمہ آثارِ قدیمہ کے کرنے کا ہے۔"

مگر ہندوستان کے محکمہ آثارِ قدیمہ نے عمارت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور عمارت کی حالت خستہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اودھ کی تہذیب کا نقطۂ عروج۔ جو حال تہذیب کا، وہ اس کی عمارتوں کا۔ میں نے کیا غلط کہا کہ لکھنؤ آہستہ آہستہ ڈھے رہا ہے۔ مگر کس وقار سے ڈھے رہا ہے۔

ہم نکلنے لگے تو ایک عزادار گلاب کے پھولوں سے بھری ہوئی تھالی کے ساتھ ہمارے پاس آیا۔ ایک ایک پھول نذر کیا۔ میں نے کچھ روپے نکال کر تھالی میں رکھنا چاہے۔

"نہیں جناب۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

ایک گلاب کا پھول بڑے امام باڑے سے۔ ایک گلاب کا پھول چھوٹے امام باڑے سے۔ ساتھ میں ایک ایک الائچی۔ نذر نیاز کے نام پر یہاں آپ سے کوئی کچھ نہیں لے گا۔

آپ دینے کی کوشش کریں گے تو آپکو ایسا جواب ملے گا کہ آپ اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔ رسی جل چکی ہے پر بل باقی ہیں۔ لکھنؤ ڈھے رہا ہے مگر کس قدر وقار کے ساتھ۔

تو صاحبو! لکھنؤ ہم نے دیکھ لیا۔ کونسا لکھنؤ دیکھنے گئے تھے۔ کونسا لکھنؤ دیکھا۔ پھر مجھے انیس کا مصرع یاد آتا ہے۔ ع

اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

یاں کے زمین و آسماں تو میر انیس ہی کے وقت میں بدل گئے تھے اور اب تو وقت ہی اور ہے۔ تو بہت لکھنؤ میں رہ لئے۔ اب یہاں سے نکلو۔ جتنا رہے بہت رہے۔۔۔۔ بزرگوں کو دیکھا۔ ہمعصروں سے ملے، نوجوانوں کی بانگی دیکھی۔ خواتین کا چہار دیواری سے نکل کر کچھ کرنے کا شوق دیکھا۔ رام لال کو دیکھا۔ ڈاکٹر نیر مسعود کو دیکھا۔ پروفیسر شبیہ الحسن کی دید، مرزا جعفر حسین کی شنید۔ واہ واہ کیا کتاب لکھی ہے۔ "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" تو اب دیکھنے کو کیا باقی رہ گیا۔ جمیل جالبی تو پہلے ہی سٹک گئے۔ اب تم بھی ٹلو۔ پٹنہ میں دوست تمہاری راہ تک رہے ہیں۔



پٹنہ میں پہلے دن کے پروگرام کا تو پٹڑا ہو گیا۔ دلی میں شاہد مہدی سے معاملہ یہ کیا تھا کہ دیکھو بھائی تم امورِ بہار کے افسر ہو۔ ایسا بندوبست کر دو کہ میں ایک نظر نالندہ کو دیکھ آؤں۔ لپک جھپک جاؤں۔ الٹے پیروں آؤں۔ گیا نہ سہی نالندہ سہی۔ اس عزیز نے دلی سے تار برقی دوڑا دوڑا کے اپنی طرف سے سارا انتظام کر دیا تھا لیکن پٹنہ پہنچتے پہنچتے یہ پروگرام تلپٹ ہو گیا۔

پٹنہ میں مشہد کی دو نوخیز گردھیں بھٹکتی نظر آئیں۔ یونس مشہدی، شفیع مشہدی۔ میں نے مشہدی نمبر ایک سے کہا کہ بھائی۔ نالندہ تو نہیں جا سکے۔ چلو چل کے گنگا ہی سے مل لیں۔

"ہاں بالکل"۔

موٹر نے بہت فراٹے بھرے مگر گنگا کنارے پہنچتے پہنچتے شام پڑ گئی۔ اور جلدی ہی کالی بھی ہو گئی۔ اور پٹنہ میں بجلی کا بحران آیا ہوا تھا۔ گنگا اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تو گنگا کی دید سے بھی گئے۔

"تو چلو پھر خدا بخش لائبریری ہی میں جھانک لیں۔ اس وقت کھلی ہو گی؟"

"شاید کھلی مل جائے۔ نہ بھی کھلی ہو تو چلنے میں کیا مضائقہ ہے۔ عابد رضا بیدار صاحب تو

تو ہوں گے ہی۔ ان سے ملئے"۔

اس نامی گرامی کتب خانے میں مجھے یارِ عزیز مظفر علی سید کس قدر یاد آیا۔ ذرا قدرت کی کرشمہ سازی دیکھو۔ یہاں آنا تھا مظفر علی سید کو، آیا ہیں۔ بھلا مجھے کیا پتہ چلے گا کہ کونسا مخطوطہ کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔ خیر میں واپس جا کر مظفر کو یہ تو بتا ہی سکتا ہوں کہ میاں! کس خیال میں ہو۔ خدا بخش لائبریری میں ہماری کتابیں ہی نہیں اب ہماری آواز بھی محفوظ ہو گئی ہے۔ خیر تو یہ اگلے دن ہوا۔ اس وقت لائبریری بند تھی۔ عابد رضا بیدار صاحب سے البتہ ملاقات ہوئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ عابد رضا صاحب خدا بخش لائبریری کے لائبریرین ہیں۔ ہمعصر ادب سے بے تعلق، مخطوطوں، مسودوں میں غرق کوئی بزرگ ہوں گے۔ مجھے اپنا تعارف کرانا پڑے گا کہ میں بھی کچھ افسانے کے نام پر کیلا کانٹی کرتا ہوں۔ مگر وہ تو دوسری طرح کے آدمی نکلے۔ مجھے بالکل اپنا تعارف نہیں کرانا پڑا۔ اور پھر ان کی بیگم تو میرے افسانوں کی باقاعدہ قاری نکلیں بقول عابد رضا صاحب مداح۔

یہاں مجھے سیمینار کے پروگرام کا صحیح پتہ چلا۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے بات یہ تھی کہ میرے تصور میں تو پروگرام اس طرح تھا کہ پہلا دن طنز و مزاح کے مضامین کے لئے وقف ہو گا۔ میں بھی اپنی پوتھی میں سے کوئی ایسی تحریر نکال کر پڑھ دوں گا جس پر طنز و مزاح کا گمان گزرے۔ اس سے اگلا دن اکبر الہ آبادی پر مقالوں کیلئے مخصوص ہو گا اس دن مجھے اکیڈمی سے معذرت کر کے صبح ہی صبح دلی لوٹ جانا ہے۔ اب پتہ چلا کہ طنز و مزاح کے مضامین کی نشستیں تو آخری دن ہوں گی۔ پہلا دن تو اکبر الہ آبادی کے لئے وقف ہے۔ تو پھر میں کیا کروں گا اور کس طرح سیمینار میں اپنی آمد کو حلال کروں گا۔

عابد رضا صاحب نے میری پریشانی دیکھ کر کہا کہ کلیم الدین صاحب کو فون کر کے بات کر لیجئے۔ اور ان کے اس کہنے پر یکایک مجھے احساس ہوا کہ ارے اس شہر میں تو



کلیم الدین احمد بیٹھے ہیں۔ اور اکیڈمی کے صدر ہیں۔ ان سے آنکھیں چار ہوں ہی ہوں۔ مارے گئے۔ اس بزرگ نے تو اردو کے سارے شاعروں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے توپ دم کر دیا تھا۔ میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ میں مذبذب کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ ایسے جلالی نقاد کو اندھا دھند کیسے ٹیلی فون کر لوں۔ مگر عابد رضا صاحب نے فوراً فون ملایا اور ریسیور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

میں نے اپنی مشکل بیان کی کہ "مقالہ تو میرے پاس ہے نہیں۔ پھر حقِ نمک کس طرح ادا کروں گا اور سیمینار میں کیا کروں گا"۔

"آپ وہی کریں گے جو آپ کا فن ہے۔ آپ اپنا افسانہ سنائیں گے"۔

"افسانہ؟ مقالوں کے بیچ افسانہ۔ یہ تو انمل بے جوڑ بات ہو گی"۔

"کوئی انمل بے جوڑ بات نہیں ہو گی۔ پروگرام کل کا اس طرح ہے کہ وزیرِ اعلیٰ صاحب جناب جگن ناتھ سیمینار کا افتتاح کریں گے۔ آپ صدارت کریں گے۔ مقالوں کی دوسری نشست کے بعد چائے کا وقفہ۔ اس کے بعد آپ افسانہ سنائیں گے"۔

تحریر میں جتنے کھرّے بات کرنے میں اتنے ہی نرم۔ دیکھا تو زیادہ ہی نرم دکھائی دیئے۔ اپنی گوری رنگت اور سفید پائجامے شیروانی کے ساتھ بالکل میدے کی لوئی لگ رہے تھے۔ چپ چپ۔ سارے مقالے سن لئے، گرم بھی نرم بھی۔ مجال ہے کہ پہلو بدلا ہو اور سانس لیا ہو۔ ردِ عمل کا ذرا جو پتہ چلنے دیا ہو۔

وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ نے سیمینار کا افتتاح ایک گرم تقریر سے کیا۔ اعلان کیا کہ اکیڈمیوں کی حد تک اردو کو نہیں رہنے دیا جائے گا۔ یہ تو عوام کی زبان ہے۔ جب ہی تو اسے صوبے کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے یہ اس کا پیغام نگر نگر گاؤں گاؤں لے جایا جائے گا۔ اس کام کے لئے ساٹھ لاکھ کی رقم مختص کرنے کا اعلان۔ اردو اخباروں کو نصف رقم پر ٹیلی پرنٹر فراہم کرنے کا اعلان۔ اردو صحافیوں کی تربیت گاہ کے قیام کا اعلان۔

اور پھر اکبرالہ آبادی سیمینار کے انعقاد پر مسرت کا اظہار۔ اس خوشی کا اظہار کہ اکبرالہ آبادی الہ آبادی نہیں تھے، بہاری تھے کہ بہار کے اورنگ آباد ضلع میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ:

"یارو۔ الہ آباد کے پاس دو ہی چیزیں تھیں۔ امرود اور اکبرالہ آبادی۔ تم نے اکبر الہ آبادی کو لے لیا۔ غریب الہ آباد کی گود میں بس ایک امرود رہ گئے۔"

ایک نوجوان گرما کر بولا ____ "بالکل غلط۔ یہ الہ آباد والوں کا پروپیگنڈا ہے۔ پٹنہ کے امرودوں کے سامنے الہ آباد کے امرود کیا بیچتے ہیں۔"

مجھے الہ آباد پر اور بھی ترس آیا۔ کم از کم امرود ہی رہ جاتے۔ وہ بھی گئے۔ الہ آباد بالکل ہی تہی دامن رہ گیا۔ بے چارہ الہ آباد ____ مگر کیا کیا جائے۔ یوپی میں اردو کا کھونٹا ہی کمزور ہے۔ لکھنؤ الہ آباد کس بوتے پر پٹنہ کو للکاریں گے۔ ادھر تو اردو دوسری سرکاری زبان بن چکی ہے۔ بہار کا پلہ اب بھاری ہے۔ اب یہ لوگ کس اعتماد سے بات کرتے ہیں:

"دیکھئے صاحب تنقید، شاعری، افسانہ، چوٹی کے ادیب، ہر صنف میں اس وقت بہار ہی میں ہیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔

ایک زبان کی بحالی سے اپنے بہاری دوستوں کے یہاں کس قدر اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اردو کا بستر اس طرح تو کسی زمانے میں بھی لپٹنے نہیں دیا تھا جیسے یوپی میں لپٹا تھا۔ سخت مشکل کے زمانوں میں بھی سکول اور کالج سے اس کا دفتر یکسر نہیں مٹا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو پڑھے لکھے نوجوان دوسرے شہروں کی نسبت پٹنہ میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ اور افسانہ نگار تو قطار اندر قطار ہیں۔ شاعری سے زیادہ یہاں افسانے کا چرچا نظر آتا ہے۔



پٹنہ گرم شہر ہے اور مسلمان نوجوان کو اک ذرا چھیڑیئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے مگر میں نے تو چھیڑا ابھی نہیں تھا۔ بس انھوں نے مجھے پاکستان کا نمائندہ تصور کیا اور کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ اے نادان، مت بول۔ ان کی سن۔ وہ بسلسلۂ پاکستان دکھ اٹھانے والوں میں ہیں۔ انہیں فائدہ اٹھانے والوں کی نسبت پوچھنے کا زیادہ حق پہنچتا ہے۔ تو وہ بول رہے ہیں اور میں سن رہا ہوں۔ ایسے سن رہا ہوں جیسے بہاری مسلمانوں پر ۴۷ء سے پہلے بلکہ اس سے پہلے سے ۷۱ء تک، ۷۱ء سے اب تک جو بھی افتاد پڑی اس کا ذمہ دار میں ہوں۔

"خیر بنگلہ دیش بننے سے بہاری مسلمانوں کو فائدہ بھی ہوا۔"

"فائدہ؟ اچھا؟ کیسے؟"

"ہم یہاں کی بات کر رہے ہیں۔ پہلے یہاں یہ صورت تھی کہ جس نوجوان نے بی۔ اے کیا وہ ڈھاکہ کی طرف نکل گیا۔ یہاں سے ہم اکھڑے ہوئے تھے۔ بس، پاکستان کی طرف دیکھتے تھے۔ بنگلہ دیش نے وہ رستہ بند کر دیا۔ اب ہم پاکستان کی طرف نہیں دیکھتے، اپنی طرف دیکھتے ہیں۔ سوچ لیا کہ ہم یہیں کے ہیں۔ ہمیں یہیں مرنا جینا ہے۔ سو اب نوجوان پڑھتے لکھتے ہیں، مقابلہ کے امتحانوں میں بیٹھتے ہیں۔ آئی اے ایس بن جاتے ہیں۔ اب ہمارے حالات بہتر ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم نے اردو کی حیثیت بھی منوا لی ہے۔"

بولتے بولتے ایک نوجوان نے مجھے گھور کر دیکھا: "آپ کچھ بول نہیں رہے ہیں۔ شاید آپ کو ہماری باتیں بری لگ رہی ہیں۔"

"نوجوان دوستو! جب تم نے طے کر لیا ہے کہ تمہیں اپنے گردوپیش میں رہ کر سوچنا سمجھنا ہے تو پھر یہ تردد کیوں کہ مجھ ایسے کسی پاکستانی کو تمہاری بات اچھی لگتی ہے یا بری۔"

"بالکل ٹھیک بات۔" اور پھر ایک لمبی گرم گفتگو۔

"اچھا بھئی بہت باتیں ہوگئیں۔ وہاں تمہاری گورنمنٹ اردو لائبریری میں ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔ کڑوی کسیلی باتیں سن لیں۔ اب میٹھی باتیں بھی تو سنیں اور گلے میں گجرے ڈلوائیں۔"

صاحب وہاں بہت موٹے موٹے گجرے گلے میں پڑے۔ ان پر مستزاد کامریڈ حبیب الرحمٰن اور لطف الرحمٰن کی خیر مقدمی تقریریں اور ان پر مستزاد استقبالیہ تقریب کے صدر لکشمی میشور دیال کی صدارتی تقریر۔ اور پھر میرا خراجِ تحسین پیش کرنا پٹنہ کے افسانہ نگاروں کو اور اعلان کرنا کہ ہندوستان میں فکشن کا کوئی شہر ہے تو وہ پٹنہ ہے اور اس آن مجھے اسلام آباد یاد آیا۔ افسانہ نگاروں کے حساب سے اسلام آباد ہمارا پٹنہ ہے کہ یہ بستی بھی افسانہ نگاروں سے پٹی پڑی ہے۔ مگر پٹنہ کے افسانہ نگاروں کے افسانے تو سمجھ میں بھی آتے ہیں۔

اچھا بھئی اب کچھ بزرگوں سے بھی تو مل لیں۔ چلیں قاضی عبدالودود صاحب کی خدمت میں چلتے ہیں۔

قاضی عبدالودود علیل تھے مگر آنے والوں کو ارد گرد دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئے اور رواں ہو گئے۔ دم کے دم میں انہوں نے کتنی باتیں کر ڈالیں۔ مجھے لگتا ہے کہ پورے بہار میں کم گو اکیلے کلیم الدین احمد ہیں باقی تو ماشاءاللہ سب ہی خوب بولتے ہیں۔

لیجئے۔ قاضی عبدالودود کو بھی دیکھ لیا۔ اب پٹنہ میں دیکھنے کیلئے کیا رہ گیا بلکہ جنہیں پٹنہ میں نہ دیکھنا تھا انہیں بھی دیکھ لیا۔ اس وقت یہاں خالی بہاری مخلوق نہیں ہے کوئی دلی کا دانہ، کوئی لکھنؤ کا نمونہ، کوئی حیدر آباد کی سوغات، مطلب یہ کہ اکبر الہ آبادی کی تقریب ہے۔ شہر شہر کا نقاد اور مزاح نگار یہاں اکٹھا ہے۔ الٰہ آباد، حیدر آباد کی دو چیزیں یہاں موجود ہیں۔ مجتبیٰ حسین تو ہیں ہی، یوسف ناظم بھی ہیں۔ جثے کے حساب سے مختصر مگر چپکتے خوب ہیں۔ فقرہ اچھا کہتے ہیں۔ لکھتے بھی اچھا ہوں گے۔



اگلے دن تک ٹھہرنا تو انہیں سن لیتا۔ اور ہاں وجاہت علی سندیلوی بھی تو آئے ہوئے ہیں۔ یہ سب کل اپنے اپنے طنز و مزاح کے نمونے پیش کریں گے۔ اس کے بعد؟

"اس کے بعد ہم گیا جا رہے ہیں۔"

"اچھا آپ لوگ گیا جا رہے ہیں۔"

گیا کا نام سن کر میرے دل میں گُدگُدی ہونے لگتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ٹک جاؤں۔ میں بھی کتنا مورکھ ہوں۔ پٹنہ تک آ گیا ہوں اور گیا سے منہ موڑ کر جا رہا ہوں۔ مگر اچانک میرے ذہن میں ایک سوال کروٹ لیتا ہے۔

یہ لوگ گیا کس خوشی میں جا رہے ہیں؟ میں کس خوشی میں جاتا۔ یہ تو میں جانتا ہوں مگر کیا ضرور ہے کہ میری خوشی ان کی بھی خوشی ہو۔

"کیوں صاحب! یہ قافلہ گیا کس خوشی میں جا رہا ہے۔"

"آپکو پتہ نہیں وہاں طنز و مزاح کانفرنس ہو رہی ہے۔"

"طنز و مزاح کانفرنس گیا میں؟ عجب بات ہے۔"

"کیوں۔ عجب بات اس میں کیا ہے؟"

"گیا تو مہاتما بدھ کا نگر ہے۔"

"تو کیا مہاتما بدھ کے نگر میں ہنسنا منع ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ کیا کہتا۔ اس گھڑی مجھے اپنے شہر کا عجائب گھر یاد آیا جہاں ایک دفعہ گندھارا آرٹ کے نگینے دیکھتے دیکھتے میں نے اپنے دوست کی توجہ ایک نگینہ کی جانب دلائی۔

"دیکھو۔ یہاں مہاتما بدھ کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔"

اس نے دیکھا اور اپنی معلومات کا خزانہ بکھیرتے ہوئے کہا ——— "ہاں یہ لافنگ بدھا (LAUGHING BUDDHA) ہے۔"

اس وقت بھی بس ایسے ہی چپ رہ گیا تھا۔ یعنی یہ تبسم جو پوری طرح تبسم بھی نہیں ہے لافٹر ( LAUGHTER ) کے ذیل میں چلا گیا۔ مہاتما بدھ اُس تبسم زیر لب کی بنا پر جو ان کے من کی شانتی اور آنند کی کوئی کیفیت ہوگی لافنگ بدھا بن گئے۔ مگر اب گیا میں سچ مچ لافنگ بدھا رنگ رنگ کے بھانت بھانت کے جمع ہو رہے تھے۔ بودھی برکش کو یہ دن بھی دیکھنے تھے۔

"مگر آپ کم از کم یہ سیمینار تو پورا کر کے جائیں۔"

"جناب مجھے بھاگم بھاگ دلی پہنچنا ہے۔ وہاں سے حیدرآباد کے لئے دوڑ لگانی ہے۔"

"اچھا۔ آپ حیدرآباد جا رہے ہیں۔ دیکھئے وہاں کوہِ مولا علی ضرور جائیے۔"

یہ پروفیسر شبیہ الحسن تھے جنہیں میں شروع میں خالص پروفیسر اور نقاد سمجھتا رہا۔ پھر کسی دوست نے بتایا کہ وہ ذاکر غضب کے ہیں کہ منبر پر جب بیٹھتے ہیں تو مومنین کو دھاروں رلواتے ہیں۔

شبیہ الحسن کا روئے سخن اصل میں ہماری بیگم کی طرف تھا۔ صحیح طرف تھا۔ پھر جو کوہِ مولا علی کا وظیفہ شروع ہوا تو حیدرآباد تک جاری رہا مگر بیگم ہی کے چکر میں ہماری مفت میں بہار سے نسبت قائم ہو گئی۔ عین گنگا کنارے پہنچ کر اس نیک بخت کو خیال آیا کہ گھاٹ پر اس کی ننھیال کے لوگ رہتے ہیں۔

"گھاٹ تو بہت دور ہے اور اب رات ہو چکی ہے۔"

"اور بگنا پہاڑی۔ وہاں بھی میری ننھیال والے رہتے ہیں۔"

یونس مشہدی نے فوراً اپنے تعاون کا ہاتھ بڑھایا...... "ہاں ہاں اس گھرانے کو تو میں جانتا ہوں۔ وہاں کی ایک لڑکی میری کلاس فیلو رہی ہے۔"

اے لو، موٹر کا رخ بدلتا ہے اور ہم کتنی اندھیری سڑکوں سے گزرنے کے بعد بگنا



پہاڑی جا پہنچتے ہیں کب کے بچھڑے کب ملتے ہیں اور کس رنگ میں ملتے ہیں کہ بزرگ جو پہچان سکیں موجود نہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں موجود ہیں۔

"ہاں ہاں۔ ہم نے اماں جان سے آپ لوگوں کا ذکر سنا ہے۔ بہت یاد کیا کرتی ہیں آپ لوگوں کو۔"

اور واپس ہوتے ہوئے یونس مشہدی نے مجھ پر چڑھائی کی۔ "آپ تو کہتے تھے کہ بہار سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہاں۔ بہار سے میرا کسی راستے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مگر آپکی بیگم صاحب کا تو ہے۔"

"ہاں۔ ان کا ہے۔"

"وہ تو ہیں ہی بہارن۔ مگر ان کے واسطے سے آپ بھی تو آدھے بہاری ہو گئے۔"

دیکھئے صاحب۔ آدمی کے جب دن پھرتے ہیں تو کس طرح پھرتے ہیں۔ میں سیمینار میں شرکت کی غرض سے پٹنہ گیا تھا، اجنبی بن کر اس شہر میں داخل ہوا۔ اور اب واپس ہو رہا ہوں تو آدھا بہاری بن کر ——— آدھا بہاری جس کا نصف بہتر بہاری ہے۔

گنگا سے جو پھسلا لبِ جمنا پہنچا۔ پٹنہ سے اڑا، دلی میں اترا۔ فلائٹ میں تاخیر نے دن تو غارت کر دیا شام غارت نہیں ہونی چاہیے۔ چلو کما نیہ آڈیٹوریم چلتے ہیں۔ وہاں آج اوما شرما کتھک دکھا رہی ہے۔ بہت شہرت سنی ہے اوما شرما کے کتھک کی۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔ اے لو جمیل جالبی یہاں پہلے سے جمے بیٹھے ہیں۔ علی گڑھ کو نواز کر آرہے ہیں۔

اوما شرما کا کتھک اپنے عروج پہ ہے۔ ایک دور، دوسرا دور۔ داد دینے والے کھڑے ہو کر تالیاں بجا چکے۔ داد کے ڈونگرے برسا چکے۔ پھر روشنیاں گل ہو جاتی ہیں تیسرا دور شروع ہونے کو ہے۔ اہلِ ذوق اوما شرما کے انتظار میں دم سادھے بیٹھے ہیں۔ اوما ابھی سٹیج پہ نہیں آئی ہے مگر نارنگ صاحب آن پہنچے ہیں۔

"مہمان آچکے ہوں گے۔ بس اٹھ چلو"۔

لیجیے یہ عجیب تیج پڑا۔ ادھر اوما شرما کا کرشمہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے کہ جا اینجا ست ادھر نارنگ صاحب کے گھر سجی ہوئی محفل پکارتی ہے کہ بہت مت پھیلو۔ اب آجاؤ تو اے اوما دیوی! ہمیں شما کر دیجیو۔ ہم بیچ تیری نرت کے اندھیرے میں یہاں سے سٹکتے ہیں اور نارنگ صاحب کی طرف چلتے ہیں۔

نارنگ صاحب کے گھر کی محفل کا قصہ مختصر یہ ہے کہ اور دوست تو تھے ہی۔ وہاں احمد فراز بھی تھے اور کنور مہندر سنگھ بیدی بھی۔ سو یاروں نے کھایا پیا، شعر سنے، اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے بھی جلدی ہے کہ صبح علی گڑھ جانا ہے۔ مگر پتہ چلا کہ کوئی سفر ایک مرتبہ کھوٹا ہو جائے تو پھر کھوٹا ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ پتہ نہیں علی گڑھ کے نام پر کسی بدخواہ کو چھینک آ گئی تھی یا کالی بلی رستہ کاٹ گئی تھی یا نیل کنٹھ دائیں سے بائیں گزر گیا تھا۔ بہر حال ہوا یوں کہ ہولی نے ہمارے رنگ میں بھنگ ڈالا۔ اب آمد و رفت کا اندراج کرنے والوں نے کھنڈت ڈالی۔ یہ دیکھ کر کہ علی گڑھ میں ہولی منانے والوں اور پولیس کے بیچ ٹھن گئی ہے اور شہر میں کرفیو لگ گیا ہے۔ میں نے کنی کاٹی اور لکھنؤ اور پٹنہ کی طرف نکل گیا۔ واپس آیا تو نارنگ صاحب نے کہا:

"کل کا دن تمہارا خالی ہے۔ ادھر علی گڑھ کا مطلع صاف ہو چکا ہے۔ خالی دن کو خالی مت رہنے دو۔ ثریا حسین سے پروگرام طے ہو گیا ہے"۔

دو روزہ پروگرام غتر بود ہو گیا۔ اب یک روزہ پروگرام پر قناعت کرو۔ صبح جاؤ شام کو واپس آ جاؤ۔ مگر صاحب، دن کے دن کیسے جائیں کیسے آ جائیں۔

"لو۔ یہ کونسی مشکل بات ہے۔ رحمٰن نیر کی کار موجود ہے۔ فراٹے بھرتی جائے گی۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے موقعۂ واردات پہ پہنچائے گی۔ سیدھے سٹیج پر جاؤ۔ گلے میں گیندے کا ہار ڈلواؤ۔ شکریئے کی تقریر کرو۔ افسانہ پڑھو۔ داد لوٹو"۔

مگر پھر وہی مضمون کہ ؎

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

آمد و روانگی کا اندراج کرنے والوں نے ہتھے پہ ٹوک دیا۔

"اچھا یہ پٹنہ سے روانگی کا اندراج ہے۔ آپ پٹنہ سے روانہ ہوئے۔ ٹھیک۔ مگر کہاں کے لئے؟"



"دلی کے لئے۔ اور کہاں کے لئے"۔

"مگر یہاں تو دلی کا حوالہ نہیں ہے۔ ہمیں کیا پتہ ہے کہ آپ پٹنہ سے کہاں کیلئے روانہ ہوئے۔ جب شہر کا حوالہ ہی نہیں تو آپ کہیں بھی جا سکتے تھے۔ پاکستان ہی چلے جاتے"۔

"مگر آپ دیکھ رہے ہیں میں پاکستان نہیں گیا ہوں۔ پٹنہ سے دلی آیا ہوں"۔

"ہمیں کیا پتہ۔ کاغذ میں تو دلی کا نام ہی نہیں ہے"۔

ہت تیری دم میں نمدا۔ اسے سرکاری کاغذ۔ سب کچھ تو ہوا۔ امرِ واقعہ کچھ نہ ہوا۔ واقعہ جائے بھاڑ میں۔ کاغذ کا پیٹ بھرنا چاہئے۔

اس بک بک جھک جھک میں کتنا وقت نکل گیا۔ اوپر سے ہو گئی بارش۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ کہیں ڈیڑھ دو بجے جا کر علی گڑھ کے کنارے لگے۔

"ارے آپ اب آ رہے ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ آپ نے پروگرام منسوخ کر دیا۔ کتنی دیر لوگوں نے انتظار کیا۔ طلبہ تو کرسیاں توڑنے پہ آمادہ تھے۔ اس ہجوم کو قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے چائے پلا کر اور اللہ رسول کا واسطہ دے کر انہیں رخصت کیا ہے"۔

مگر پھر فوراً ہی ثریا حسین نے لیجیو، دوڑیو شروع کر دی۔ کتنے شرفاء کو رستے میں سے پکڑ بلایا۔ کتنے معززوں کو گھر کی ڈیوڑھی نانگھتے نانگھتے جا دبوچا۔

"چلیں صاحب واپس۔ وہ ناہنجار پاکستانی مہمان آن پہنچا ہے"۔

مگر جو نقشہ ایک دفعہ اکھڑ جائے وہ پھر اس طرح کہاں جمتا ہے۔ خیر جتنا ہوا اچھا ہوا۔ مگر جب ہال سے نکلتے ہوئے سٹوڈنٹس یونین کے سیکرٹری نے آ کر کہا کہ:

"یونین شام کو آپ کیلئے تقریب کرنا چاہتی ہے"۔

تب میرا دل تلملایا۔ یونین کی وہ شام ایک دم سے تصور میں گھوم گئی جب اوپر کسی بالکنی سے

گیندے کی پتیاں ہم پہ برسی تھیں۔ اس سمے وہ پیلی پیلی پتیاں کتنی سہانی لگی تھیں۔ وہ پھولوں بھری شام اب کے میرے نصیبوں میں نہیں تھی:

"برادر، میں تو کھڑے کھڑے آیا تھا۔ دیر بہت ہو گئی ہے۔ الٹے پاؤں واپس جا رہا ہوں"۔

واپس جاتے جاتے میں نے علی گڑھ پبلشنگ ہاؤس کے اسد یار خاں کے گھر پہ ایک دستک دی۔ دوسری دستک خلیق احمد نظامی کے گھر پر۔ سوچا کہ میرٹھ نہیں جا سکے تو اس عزیز سے مل کر میرٹھ کالج کے دنوں کی یاد ہی تازہ کر لیں۔ اور دیکھیں تو سہی کہ خلیق نظامی محقق مؤرخ بن جانے کے بعد اب کیسے لگتے ہیں۔ کیسا لگتا تھا۔ وہی یکمشت جثہ جو تب تھا وہ اب بھی ہے۔ غیر نگہ دروازے سے نکل کر کالج جاتے ہوئے اور موٹی موٹی کتابوں کے ساتھ لائبریری سے سیڑھیاں اترتے ہوئے برآمدے سے گزرتے ہوئے کلاس میں داخل ہوتے ہوئے جیسے اُن دنوں لگتے تھے ویسے ہی اب لگتے ہیں۔ تاریخ سے شغف بھی کونسا نیا واقعہ ہے۔ یہ چیٹک اس وقت بھی لگی دکھائی دیتی تھی۔ دیکھو کیا خدا کی قدرت ہے سارے گرد طاق در طاق از فرش تا سقف کتابیں اتنی موٹی موٹی۔ ان کے بیچ بیٹھا ہوا آدمی اتنا باریک۔

اچھا بھئی شہریار اور اچھا بھئی ابوالکلام قاسمی۔ اب پانچ بجنے لگے ہیں۔ ہمیں چلنا چاہئے نہ سہی پوری ملاقات، علی گڑھ کو کم از کم چھُو چلے ہیں۔ غنیمت ہے کہ چار دوستوں سے مل لئے جن سے نہ مل پائے انہیں سلامِ غائبانہ۔ لیجئے علی گڑھ کے یہ دو دانے بھی رخصت ہوئے اب بس اپنے ساتھ شمس الحق عثمانی ہیں جو دلی سے میرا سہارا بن کر ہمسفر ہوئے تھے اور سامنے دلی جانے والی لمبی سڑک ہے۔

یہ تو سچ مچ شام پڑنے لگی ہے۔ علی گڑھ کا دن اپنے کیمپس کی چہل پہل کے ساتھ۔ برآمدوں کے اندر باہر اہلے گہلے پھرتے طلباء کے ساتھ کہیں پیچھے رہ گیا۔ اب سامنے



دور تک لمبی مسلسل سنسان سڑک ہے اور اس پہ دھیرے دھیرے اترتی پھیلتی شام۔ دلی جیسے بڑے شہروں میں شام پڑنے کا طور کچھ اور ہے۔ وہاں تو وہ ایک نئی رونق لے کر اترتی ہے۔ میں ان شاموں میں ایسا کھویا کہ سمجھا کہ اب اس دیار میں شاموں کی صورت یہی ہے۔ مگر اب جب میں علی گڑھ اور دلی کے بیچ سنسان سڑک پہ شام کر رہا ہوں تو ایک اپنائیت کے ساتھ پہچان رہا ہوں کہ یہ تو ویسی ہی شام ہے، اسی طور اتر رہی ہے کہ رستوں کا رفتہ رفتہ سنسان ہوتے چلے جانا، شور کرتے پرندوں کا ایک گھبراہٹ کے ساتھ کچھ زیادہ شور کرنا پھر خاموش ہوتے چلے جانا، بالکل خاموش ہو جانا۔ اور پھر قریب کے کسی درخت کی کسی گھنی شاخ کے بیچ کسی جھاڑی کے اندر پہ دل کی ایک مضطرب پھڑپھڑاہٹ۔ دور سے کسی بھٹکے ہوئے مور کی پکار۔ شاید اس وقت بھی آس پاس کی کسی بستی میں کوئی بڑی بی روک ٹوک کر رہی ہونگی کہ بیٹی سر ڈھکو۔ دونوں وقت مل رہے ہیں۔ . . . . لال اس وقت کہاں جا رہا ہے دونوں وقت مل رہے ہیں۔ . . . . بی بی اس وقت کو سامت دے، دونوں وقت مل رہے ہیں۔ . . . یہ وقت جب جھٹ پٹے میں دو وقت ملتے ہیں اس دیار میں کتنا تشویش بھرا چلا آ رہا ہے صدیوں سے۔ شاید جنم جنم سے۔ آج بھی ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین نے کہا نہیں تھا کہ شام سے پہلے نکل جانا رستہ ذرا خراب ہے۔ ایک زمانے میں رستے یہاں بہت خراب رہ چکے ہیں۔ اب اچھے ہو گئے ہیں۔ مگر بس پھر کسی بستی میں کچھ ہو جاتا ہے اور اچھے بھلے رستے ایکدم خراب ہو جاتے ہیں۔ علی گڑھ شاید کرفیو کے اثرات سے ابھی پوری طرح نکلا نہیں ہے۔ اس کی شاموں کی خاموشی خالی خاموشی نہیں ہے، تشویش بھری بھی ہے۔

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں۔ سٹیشن تیزی سے آتے ہیں، تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ ریل گاڑی آندھی دھاندی اڑی چلی جا رہی ہے۔ کوئی سٹیشن آتا ہے تو اس کے سوا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پہیوں کی گڑگڑاہٹ اونچی ہو جاتی ہے۔ ایک بلند آہنگی کے ساتھ گزرتی ہے اور جب پلیٹ فارم پہ کھڑے لوگ، جھلملاتی روشنیاں ایک تیزی سے سامنے سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں تو گاڑی پھر اپنے پچھلے آہنگ پہ آ جاتی ہے۔ جب مجتبیٰ حسین نے کہا تھا کہ جہاز میں کیا رکھا ہے۔ اس گاڑی میں ذرا سفر کر کے دیکھو۔ حیدرآباد جانے والی تیز ترین گاڑی ہے۔ درمیان میں کہیں نہیں رکتی صرف تین سٹیشنوں پہ ـــــ تو میں بہت مطمئن ہوا تھا لیکن اب میرا اطمینان رخصت ہو چکا ہے۔ اس برق رفتاری نے مجھے بے اطمینان کر دیا ہے۔ جب کسی بڑے سٹیشن کے آثار ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ یہاں تو گاڑی رکے ہی گی۔ مگر جب خلقت سے بھرے رنگارنگ خوانچوں ریڑھیوں سے سجے جگمگ کرتے پلیٹ فارم کے برابر سے ایک بے تعلقی کے ساتھ گاڑی گزری چلی جاتی ہے تو مجھ پر اوس پڑ جاتی ہے۔ ایک الجھن سی ہو رہی ہے۔ آخر گاڑی کسی سٹیشن پہ تو رکے۔ ذرا تو دم لے۔ میں ریل گاڑی میں بیٹھا ہوں یا جہازِ عمرِ رواں پہ سوار ہوں۔ سوار کاہے کو ہوں

بے اختیار بیٹھا ہوں۔ بے شک بہت کوفت ہوتی ہے جب گاڑی ہر چھوٹے بڑے سٹیشن کو نوازتی ہوئی چلتی ہے۔ مزید کوفت ہوتی ہے جب وہ کسی بہت بے معنی سے سٹیشن پر رک جاتی ہے اور مسافروں کے صبر کا پورا امتحان لے کر سٹیشن سے نکلتی ہے مگر تھوڑی دور چل کر پھر ویرانے کے بیچ کھڑی ہو جاتی ہے۔ کھڑی رہتی ہے حتیٰ کہ مسافر بور ہو کر ڈبوں سے نکل پڑتے ہیں اور پٹڑی پر، پٹڑی سے اتر کر ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگ جاتے ہیں۔ گھومتے پھرتے رہتے ہیں اس وقت تک جب تک کہ برابر سے کسی اجنبی گاڑی گزر جانے کے ساتھ ان کی گاڑی سیٹی دے کر انہیں واپس نہیں بلاتی۔ سفر میں یہ مرحلے بڑے بیزار کن ہوتے ہیں مگر انہیں مرحلوں سے گزر کر تو سفر تجربہ بنتا ہے اور اجنبی زمینی منظر کچھ کچھ اندر راہ پاتے ہیں اور حافظہ کا حصہ بنتے ہیں۔ اگر تھوڑا اجنبی لینڈ سکیپ، تھوڑے نئے نئے تازہ تازہ زمینی منظر بھی آپ نے اپنے اندر نہیں سمیٹے تو پھر سفر سے آپ کو کیا حاصل ہوا۔ اور یہی وہ ماحصل سفر ہے جس سے ہوائی جہاز کے سفر نے ہمیں محروم کر دیا ہے۔ . . . . . مگر میں کیسی گاڑی میں سوار ہوا ہوں کہ ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ زمینی منظر کس تیزی سے نظروں کے سامنے سے گزر رہے ہیں اور زمینی منظر بھی کہاں کے، جنوبی ہند کے جس کا اپنا ایک جادو ہے۔ جھانسی ؟ . . . . . اچھا جھانسی آ رہا ہے۔ کیا یہاں بھی گاڑی نہیں رکے گی؟ نہیں یہاں تو اسے رکنا ہی چاہیئے۔ یہ رانی جھانسی کا نگر ہے۔ لو رکنے لگی ہے۔

جھانسی آ گیا۔

گاڑی رک گئی۔

اچھا یہ جھانسی ہے۔ کتنی حیرت ہو رہی ہے مجھے۔ حیرت کس بات پر؟ کونسی خاص بات ہے اس سٹیشن میں۔ جیسے اور سٹیشن ویسے جھانسی کا سٹیشن۔ کیا پاکستان کیا ہندوستان۔ برصغیر کے سب سٹیشن ایک ہی طرح کے، ایک ہی کینڈے کے ہوتے ہیں۔



لکھنؤ اور بنارس کے سٹیشن بھی بس باہر سے اور طرح کے ہیں۔ اپنے الگ الگ مخصوص تہذیبی رنگ کو پیشانی پر لیئے ہوئے مگر اندر سے وہ بھی کہاں مختلف ہیں اس یکرنگی کے باوجود کوئی کوئی سٹیشن، کوئی بہت معمولی سا سٹیشن کتنی حیرتیں لیکر نمودار ہوتا ہے۔ وہ کونسا سفر تھا۔ میں اورنگ آباد سے آ رہا تھا۔ نہیں شاید بنارس سے لوٹ رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی رکی۔ جھانک کر دیکھا _____ ارے جائس ؟ یہ جائس ہے۔ ملک محمد جائسی کا نگر۔ میں ابھی حیران ہو رہا تھا کہ گاڑی چل پڑی۔ جس سٹیشن پہ ہم چاہتے ہیں کہ گاڑی دیر تک رکے کہ ذرا اتر کر ہم اس نگر کے زمین و آسمان کو آنکھ بھر کر دیکھیں بس اسی سٹیشن پہ سے گاڑی جلدی سے گزر جاتی ہے۔ جیسے جس چہرے کو ہم آنکھ بھر کر دیکھنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم اس سے بولیں، بات کریں بس وہی چہرہ آنکھ جھپکتے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور میں ابھی حیران ہو رہا ہوں کہ اچھا یہ جھانسی ہے۔ یہاں ہوا کرتی تھی رانی جھانسی کہ سیٹی بجتی ہے اور گاڑی چل پڑتی ہے۔

ناگپور۔ ناگپور تو گاڑی رکے ہی رکے۔ رکی اور اتنی دیر رکی کہ میں نے ڈبے سے اتر کر اطمینان سے سنترے خریدے۔ خرید کر اندر آیا۔ پھر لپک کر باہر گیا۔ یہ ناگپور کے سنترے ہیں بہت سے خرید لینے چاہئیں۔ حیدرآباد تک کھاتے جائیں گے۔ ایک کھایا دوسرا کھایا، تیسرا کھایا۔ یا اللہ یہ ناگپور کے سنترے ہیں۔ ناگپور کے سنتروں کو کیا ہو گیا۔ میں پاکستان کے اہلِ ثمر سے چڑا ہوا تھا کہ انہوں نے نارنگی کو غائب کر دیا اور کینو شینو کے چکر میں سنترے کو گم کر دیا۔ اچھا ہو گا کینو رسیلا پھل مگر سنترے کے چھلکے کی مہک اس کے چھلکے میں کہاں سے آئے گی۔ سنترے کا مہکتا چھلکا جس سے دلہنوں کے لیئے ابٹن تیار ہوتی ہے اور اب میں ناگپور کا سنترہ کھا رہا ہوں اور بالکل پتہ نہیں چل رہا کہ یہ ناگپور کا سنترہ ہے معلوم ہوا کہ پورے برصغیر میں سنترے پہ زوال آ چکا ہے۔

زوال کہاں نہیں آیا۔ کونسا ذائقہ سلامت رہ گیا ہے۔ سندیلہ کے لڈوؤں کی شکایت مجھے وجاہت علی سندیلوی سے کرنا پڑی:

"صاحب! سندیلہ کے سٹیشن پر میں نے بڑے شوق سے سندیلہ کے لڈو خریدے خود کھائے جمیل جالبی کو کھلا کر دیکھے۔ ان میں وہ مزہ ہی نہیں تھا۔"

"ہنڈیا میں تھے"۔

"جی۔ ہنڈیا ہی میں تھے۔ ہنڈیا تو دیسی ہی تھی، بالکل کوری۔ مگر لڈو ویسے نہیں تھے۔۔۔۔"

"اصل میں اچھے لڈو شہر میں ملتے ہیں"۔

"مگر آخر گزرتے ہوئے مسافر پہلے سٹیشن ہی سے لڈو خریدا کرتے تھے"۔

"ہاں صاحب۔ اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی"۔

پہلی سی بات اب کہاں رہ گئی ہے۔ سندیلہ میں لڈوؤں میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ چونکہ لکھنؤ میں ریوڑی میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ناگپور میں سنتروں میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ذائقے زوال میں ہیں۔ زمانے سے برکت اٹھ گئی۔ سب صنعتی عہد کی برکتیں ہیں صاحب!

چھوڑو ناگپور کے سنتروں کا قصہ۔ اب حیدرآباد آیا چاہتا ہے۔ کیسے جانا کہ آیا چاہتا ہے۔ زمین کی رنگت سے۔ اس کی ہیئت سے۔ ٹیلے نظر آنے لگے ہیں۔ بس جیسے پہاڑیاں ہوں۔ عجب ان کی رنگت ہے عجب ان کی ہیئت ہے۔ بالکل سلیٹ کا سا رنگ۔ پہاڑی اپنی سرمئی سج دھج کے ساتھ دور سے نمودار ہوتی ہے۔ قریب آتی جاتی ہے اور پھر گاڑی کے ساتھ نظر آکے سفر کر جاتی ہے۔ پہاڑی پیچھے رہ جاتی ہے۔ پھر دوسری پہاڑی اسی طرح نمودار ہوتی ہے اور اسی طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ حیدرآباد اب آیا اور اب آیا۔



آہ حیدرآباد واہ حیدرآباد۔ آہ حیدرآباد ان کے لیے جو حیدرآباد کو اس کے اچھے دنوں میں دیکھ چکے ہیں، برت چکے ہیں۔ میں نے تو حیدرآباد کو پہلے دیکھا ہی نہیں۔ اب دیکھا ہے ؏

جانا جاتا ہے کہ اس شہر سے لشکر گزرا

سو میں حیدرآباد کو شاد آباد دیکھتا ہوں اور شاد ہوتا ہوں۔ چار مینار کے ارد گرد اب بھی خوب گہما گہمی ہے۔ مکہ مسجد اب بھی نمازیوں سے خوب آباد ہے۔ محفلیں اب بھی خوب جمتی ہیں۔ ادبی جلسوں میں اتنا مجمع ہوتا ہے جتنا ہمارے یہاں صرف سیاسی جلسے ہی میں ہو سکتا ہے۔ تصور کیجئے کہ افسانہ سننے کیلئے اتنا آدمی جمع ہے کہ اردو گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ باہر جو لوگ کھڑے ہیں وہ الگ۔ افسانہ بھی کس کا۔ میرا، جیلانی بانو کا، عوض سعید کا۔ اور طنز و مزاح کے مضامین، نثر سننے کیلئے جو مجمع جمع ہوا اس کا کیا احوال بیان کیا جائے۔ یہ انجمن زندہ دلانِ حیدرآباد کا سالانہ اجتماع تھا۔ مجمع کسی چھت کے نیچے نہیں سما سکتا تھا اس لئے جلسہ کھلے میدان میں ہوا۔ ایسا عظیم الشان جلسہ اور اس کی صدارت، بھلا بوجھو تو سہی، کس نے کی؟ جناب ہم نے۔ اور ایسے ویسے نہیں۔ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی ہاشم علی خاں صاحب سے اچک کر کی۔ اس اجتماع میں یہی تو ان کے مضمون کا موضوع تھا کہ حضرات! مدعو مجھے یہ کہہ کر کیا گیا کہ آپ صدارت کریں گے، انتظار حسین مہمانِ خصوصی ہوں گے مگر جب چھپا ہوا دعوت نامہ ملا تو اس میں صدارت انتظار حسین کی لکھی تھی۔ میں مہمانِ خصوصی رہ گیا تھا۔

میں نے عرض کیا کہ جناب اس میں میری تو کوئی خطا نہیں، کمزوری آپ کی ہے۔ ہمارے شہر میں تو کوئی سیانا آئی ہوئی صدارت اس طرح ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ایک مرتبہ وہاں ڈاکٹر ملک راج آنند شہر میں وارد ہوئے تھے۔ ہم انہیں تھنکرز فورم کے اجلاس سے اٹھا کر حلقہ میں لے گئے کہ وہ اتوار کی شام تھی اور حلقے کی ہفتہ وار نشست ہو رہی تھی۔ پروفیسر

جیلانی کامران صدارت کر رہے تھے۔ ابنِ انشاؔ نے مجھ سے کہا کہ یار ملک راج آنند مہمان ہیں انہیں صدارت کی کرسی پہ بٹھانا چاہیے۔

میں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور کانوں کان یہ تجویز جیلانی کامران تک پہنچائی کہ معزز مہمان کا جو ہم سب کا سینیئر ہے مناسب لفظوں میں خیر مقدم کرو اور صدارت کی کرسی پہ بٹھاؤ۔ جیلانی کامران نے بہت اعتماد سے جواب دیا:

"حلقہ نے مجھے صدر منتخب کیا ہے۔ کوئی بھی ہو میں کسی کے لئے صدارت کی کرسی نہیں چھوڑ سکتا۔"

خیر اس نقصان کی تلافی ادارۂ ادبیاتِ اردو میں جا کر ہو گئی جہاں مسندِ صدارت پر ہاشم علی خاں صاحب رونق افروز ہوئے اور میں ان کی بغل میں مہمانِ خصوصی بن کر بیٹھا۔ ایک مختصر سی محفلِ موسیقی تھی جسے اس شائستہ و نفیس خاتون نے جو طیبہ بیگم کہلاتی ہیں آراستہ کیا تھا۔ اور اس سلیقے سے آراستہ کیا تھا کہ قلی قطب شاہ سے لیکر غالب تک ہم نے اردو غزل کے اگلے پچھلے سارے ذائقے بزنگِ موسیقی چکھ لئے۔

مختصر محفل، مختصر سامعین، ایک بزرگ، گورا رنگ، سر چاندی۔ یہ ہیں اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی و اڑلیسہ۔ میں نے اپنے آنے کی تقریب بتائی کہ میر سیمینار میں جامعہ ملیہ آیا تھا وہاں سے انجمن زندہ دلانِ حیدر آباد نے یہاں کھینچ بلایا۔

"اچھا جامعہ ملیہ" اور ایک دم سے زقند بھر کر اس کی ابتدا پر ـــ "وہ پہلے علیگڑھ میں قائم ہوا تھا۔ میں اس کی پہلی کھیپ میں ہوں۔ جب قائم ہونے لگا تو مولانا محمود الحسن کہتے تھے کہ گاندھی جی افتتاح کریں گے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ مولانا افتتاح کریں گے۔ کیا وضعداریاں تھیں اس زمانے کی۔"

دوست نے کان میں کہا کہ انہیں آسان مت جاننا۔ بڑے ٹھسے والے بزرگ ہیں۔ زمانۂ گورنری میں جے پرکاش نرائن کو کھانے پہ بلا لیا۔ وہ اپوزیشن کے لیڈر تھے مسز اندرا گاندھی



کے مخالف۔ دلی تک خبر پہنچی۔ ایوانِ صدر سے صدر نے فون کیا کہ:

"آپ نے جے پرکاش نرائن کی دعوت کی ہے؟"

"ہاں صاحب کی ہے۔ ذاتی حیثیت میں کی ہے کہ پرانے دوست ہیں۔ سرکاری حیثیت میں نہیں کی۔"

"پھر بھی اچھا ہو کہ دعوت کو منسوخ کر دیں۔"

"کیا کہا منسوخ کر دیں۔ دعوت تو منسوخ نہیں ہوگی۔ استعفیٰ آپ کی خدمت میں کل پہنچ جائے گا۔"

رات کو جے پرکاش نرائن کی بصد اہتمام دعوت کی۔ صبح استعفیٰ لکھ بھیجا۔ اب ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ چلاتے ہیں۔

اور یہ سامنے تصویر کس کی لگی ہوئی ہے؟

یہ تو ڈاکٹر محی الدین زور کی تصویر ہے۔ انھوں نے ہی تو یہ ادارہ ادبیات اردو قائم کیا تھا۔

اور یہ ارد گرد کیا لکھا ہوا ہے؟

شعر ہی شعر ہے

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کی حرمت نگینہ ہی لگ

—

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

—

دکھن ملک کھن دھن عجب ساج ہے    کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے

ادارہ ادبیات اردو میں آئے ہو تو یہاں جو خزانہ جمع ہے اسے بھی دیکھتے چلو۔ دیکھو کہ کیسے کیسے مخطوطات اور نوادرات یہاں جمع ہیں۔ اور ڈاکٹر مغنی تبسم مجھے ایک تاریک زینے سے گزار کر اوپر کی منزل میں لے جاتے ہیں۔ شام ہو چکی ہے اور یہاں اندھیرا پڑا ہے۔ گیلری میں بس ایک قمقمہ مفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹماتا ہے۔ بے چارے مہتمم صاحب ایک سوئچ دباتے ہیں، دوسرا سوئچ، تیسرا سوئچ۔ پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے تو سب ہی بلب فیوز ہو چکے۔

"اچھا خیر آپ شہنشاہ اکبر کی تلوار تو دیکھ ہی سکتے ہیں"۔

اور میں گیلری کے قمقمے کی مدھم روشنی میں شیشے میں آراستہ اکبر بادشاہ کی تلوار دیکھتا ہوں اور نیچے اتر آتا ہوں۔

ادارہ ادبیات اردو دیکھا ہے تو انجمن ترقی اردو بھی دیکھئے۔ ضرور دیکھیں گے سو ڈاکٹر مغنی نے لے جا کر مجھے انجمن کے دفتر میں ایک مختصر سی محفل کے بیچ انڈیل دیا۔ یہاں راج بہادر گوڑ بیٹھے تھے۔ جو انجمن کے سیکرٹری ہیں۔ درمیان میں ایک بزرگ، سر چاندی کا چاندی سر پر لمبی ترکی ٹوپی، مہر بلب۔ مگر جب ان سے بولنے پر اصرار کیا گیا تو پھر وقت کی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھا اور حیدر آباد کے ماضی و حال پر گفتگو کر ڈالی۔ یہ مولوی حبیب الرحمٰن تھے کہ جب زوالِ حیدر آباد کے ساتھ انجمن ترقی اردو پہ زوال آیا تو انہوں نے اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ انجمن کے نام وقف کر دیا۔ یوں انجمن کا حال بحال ہوا۔ اب وہ سرگرمی سے کام انجام دے رہی ہے۔ اس کے زیرِ اہتمام دو کالج بھی چل رہے ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے اس بزرگ کا ایک فقرہ:

"بس ہم پاکستان کے لئے دعا کرتے ہیں"۔

"اچھا انتظار صاحب۔ کل صبح ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ چلنا ہے۔ وہاں آپ کے اعزاز میں ایک جلسہ ہونا ہے"۔



"برادر اب تک کیا ہوتا رہا ہے۔ میرے گلے میں اتنے گجرے تو پڑ گئے"۔

"نہیں جناب۔ یہاں گجروں کے سوا بھی کچھ ہوگا۔ یہ حیدر آباد لٹریری فورم کی نشست ہوگی۔ یہاں آپ کے افسانوں اور ناولوں کو جانچا پرکھا جائے گا۔ عوض سعید کی صدارت میں علی ظہیر "بستی" پر مقالہ پڑھیں گے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم آپ کی نئی کہانی "برہ کی کہانی" کا تجزیہ پیش کریں گے"۔

تو لیجئے صاحب حیدر آباد لٹریری فورم کی نشست شروع ہوتی ہے۔ کیسے کیسے لوگ، یہاں جمع ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب ہری نواس لاہوٹی، ڈاکٹر سید عبدالمنان پروفیسر حبیب الرحمٰن۔ اور ہاں یہاں ڈاکٹر وحید اختر بھی نظر آ رہے ہیں۔ وہ مخدوم ادبی ایوارڈ وصول کرنے کے لئے علی گڑھ سے حیدر آباد پہنچے ہیں۔ اس جلسہ میں بھی آ نکلے ہیں۔ اور یہ ہیں غیاث متین جو اس جلسے کو چلا رہے ہیں اور جلسہ کے عین بیچ ایک خاتون وارد ہوتی ہیں۔ یہ بانو طاہرہ سعید ہیں جو اپنی نظم سنائیں گی۔

یہ شہرِ آرزو ہے محمد قلی کا شہر
نغمے کا علم و فضل کا زندہ دلی کا شہر
شعر و ادب سے پیار ہے ایسا عوام کو
جیسے لگاؤ ہوتا ہے بادہ سے جام کو
ہم لوگ وہ ہیں جو غمِ دوراں میں ہیں مگن
ہم لوگ وہ ہیں چاک گریباں میں ہیں مگن
اے دوست درمیانِ محباں خوش آمدی
در حلقۂ خلوصِ فقیراں خوش آمدی
آمد ہے ارضِ پاک کے اہلِ قلم کی عید
اے کاش یوں ہی ہوتی رہے دید و بازدید

لیجئے صاحب، نظم بھی ہو گئی۔ یوسف اعظمی صاحب نے عصری افسانے پر اپنا مقالہ بھی سنا دیا۔ علی ظہیر بستی کی چیر پھاڑ کر چکے۔ مغنی تبسم صاحب نے " برہ کی کہانی" کی چھان پھٹک کر ڈالی۔ ہم سرخرو ہوئے۔

پھر جناب ایک زوردار شام ادارہ روزنامہ "سیاست" کے زیرِ اہتمام منائی گئی۔ نریندر لوتھر صاحب آئی اے ایس صدر تھے۔ بھارت چند کھنہ آئی اے ایس ریٹائرڈ مہمانِ خصوصی۔ تقریر سیاست کے ایڈیٹر عابد علی صاحب کی۔ افسانے عوض سعید، جیلانی بانو اور اس خاکسار کے۔ عابد علی صاحب کی کیا پوچھتے ہیں۔ خالی اخبار کے ایڈیٹر تو نہیں ہیں۔ شہر کی تہذیبی زندگی کے روحِ رواں ہیں۔ اردو گھر نام کا ایوان جہاں یہ تقریب ہوئی انہیں کی کوششوں کا ثمر ہے۔ اب یہ جگہ ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ "سیاست" کا دفتر بھی دیکھا۔ یہاں دیکھنے کی ایک چیز محبوب حسین جگر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابراہیم جلیس عالمِ جاودانی کو نہیں سدھارے تھے۔ حیدر آباد آکر بیٹھ گئے ہیں۔ یوں تو مجتبیٰ حسین بھی اپنے قد کاٹھ اور چہرے کی تراش سے ابراہیم جلیس کے بھائی ہی نظر آتے ہیں لیکن مشابہت محبوب حسین جگر کے ہاں زیادہ ہے۔

عابد علی صاحب پاکستان کی صحافت کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ کر رہے تھے میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے ہمارے یہاں اردو کے اخبارات خصوصی ایڈیشن بہت نکالتے ہیں اور بہت تصویروں اور رنگوں سے سجا کر نکالتے ہیں۔ یہاں اردو اخبارات میں ایسا اہتمام نظر نہیں آتا۔

بولے : "آپ کے یہاں جس طرح اخبار کو رنگین بنایا جاتا ہے ہم اس کے قائل نہیں۔ اس سے اخبار کی سنجیدگی اور متانت مجروح ہوتی ہے۔ آپ کی صحافت میں بس ایک تجربہ ہوا ہے جو واقعی بہت اہمیت رکھتا ہے۔"

"وہ کونسا تجربہ ہے؟"



"نوری نستعلیق کا تجربہ۔ میں "سیاست" میں اس طریقہ کو اپنانا چاہتا ہوں۔ جنگ والوں سے میں نے استفسارات بھی کئے تھے مگر ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔"

"اصل میں آپ کو احمد جمیل مرزا صاحب سے رجوع کرنا چاہیئے تھا۔ یہ کارنامہ ان کا ہے۔"

نوری نستعلیق کے بارے میں ہندوستان کے اردو حلقوں میں خاصا تجسس پایا جاتا ہے۔ دلی میں حیات اللہ انصاری کھود کھود کر جالبی اور مجھ سے اسی بارے میں پوچھتے رہے۔ لکھنؤ میں بھی اس کے بارے میں سوالات کئے گئے۔

"اچھا مغنی صاحب! ادبی حلقوں سے نکل کر کبھی تو حیدر آباد کو دیکھنا چاہیئے"۔

"ٹھیک ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ کل صبح گولکنڈہ چلتے ہیں۔ بالا حصار کو دیکھتے ہیں پھر قطب شاہیوں کے مزار ہیں۔ پھر سالار جنگ میوزیم دیکھ لیں گے"۔

"اور کوہِ مولا علی۔" عالیہ کو ایک دفعہ پھر کوہِ مولا علی کی یاد شدت سے آئی۔

"ہاں کوہِ مولا علی بھی۔ مگر وہ بہت بلندی پہ ہے۔" مغنی صاحب رکے پھر کسی اور رستے پہ چل پڑے ..... "یہاں ایک پارسی خاتون تھیں۔ انہیں گلے کا کینسر ہو گیا ڈاکٹروں نے بالکل جواب دے دیا۔ کسی نے ان سے کوہِ مولا علی کا ذکر کیا۔ وہ خاتون وہاں چلی گئیں۔ رات کو اس نے خواب میں دیکھا کہ جیسے حضرت عباسؓ ہیں اور اسے مٹی چٹا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ یہ کربلا کی مٹی ہے۔ صبح اٹھی تو حلق میں کوئی چیز پھنسی ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے وہاں سے مٹی نکالی۔ پوچھا کہ آپ نے یہ مٹی کیسے کھائی ہے۔ خاتون نے جواب دیا کہ میں نے مٹی بالکل نہیں کھائی۔ پھر اس نے اپنا خواب سنایا۔ مگر ڈاکٹر نے خواب کو درخورِ اعتنا نہیں جانا۔ مٹی کا تجزیہ کیا گیا تو یہ پتہ چلا کہ یہ اس علاقے کی مٹی نہیں ہے۔ بس اس کے بعد اس خاتون کو شفا ہوتی چلی گئی"۔

لیجئے عالیہ کے یہاں کوہِ مولا علی کی زیارت کا جذبہ اور زور پکڑ گیا۔ کتنے اچھے

ہوتے ہیں وہ لوگ جو معجزہ سن کر بلا تامل ایمان لے آتے ہیں۔ ایک وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو جوشِ عقلیت پسندی میں اس سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔ میری بڑی مشکل ہے انکار کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا۔ ایمان لانے میں بھی ہچر مچر رہتی ہے۔ ضعیف الانکار بھی ہوں، ضعیف الاعتقاد بھی۔ بس کہیں درمیان میں بھٹکتا رہ جاتا ہوں۔

اچھا چلو اب گولکنڈہ چلتے ہیں۔ بالا حصار عجب قلعہ ہے۔ بلندیوں میں پھیلا ہوا ہے جتنی بلندی تک جا سکو گے اتنا قلعہ دیکھ سکو گے۔ اپنی دانست میں تو ہم نے بلندی کے بہت مراحل طے کیے مگر ایوانِ خاص اب بھی بہت بلندی پر نظر آ رہا تھا۔ بس ایک بہت اونچی چوٹی پہ ٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مغنی صاحب، جتنا ہم نے دیکھا، بہت دیکھا۔ چلو واپس چلتے ہیں۔

گرمی کا دن تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ گرمی تو لگتی رہے گی۔ بوتلیں پی کر پیاس بجھانا چاہیے مگر جس سٹال پر دستک دی وہاں بوتلیں گرم نظر آئیں۔ ایک لڑکا سائے کی طرح پیچھے تھا اس نے کتنی کوشش کی کہ کسی طرح ہم بوتلیں پی لیں۔ جب ہم شیشے میں نہ اترے تو اس نے سیدھی اپیل کی۔

"بوتلیں پی لو جی۔ مجھے کچھ پیسے مل جائیں گے"۔

"اچھا یہ بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تو پھر یوں کر کہ ہمیں پانی پلا دے"۔

لڑکا دوڑا ہوا گیا۔ جتن کر کے کہیں سے جگ لیا۔ پانی بھرا۔ ایک گلاس۔ ہم تینوں نے پانی پیا۔ میں اسے پیسے دینے لگا۔

"نہیں جی۔ پانی کے پیسے نہیں لیتے"۔

"لے لے بھائی۔ تو نے ہمیں پانی پلایا ہے۔ بوتل والا تجھے کون سی زیادہ رقم دے دیتا"۔

"نہیں جی۔ پانی پلانے کے پیسے ہم نہیں لیا کرتے"۔



"اچھا پھر مت لے"۔ مغنی صاحب گاڑی سٹارٹ کرتے ہیں۔

لڑکا ایک نئی تجویز لیکر آتا ہے۔ "یہاں پہ جی ایک پیڑ ہے۔ اس میں چالیس چور چھپ جاتے ہیں۔ وہ پیڑ نہیں دیکھو گے"۔

"اچھا۔ ایسا بھی کوئی پیڑ ہے یہاں۔ کہاں ہے"۔

"ہاں جی۔ بس تھوڑی دور ہے۔ میرے ساتھ چلو"۔

میں نے مغنی صاحب کی طرف دیکھا۔ مغنی صاحب فوراً مستعد ہو گئے۔ "ہاں ہاں چلیں"۔ اور لڑکے کو ساتھ بٹھا لیا۔

بس ابھی آیا، ابھی۔ یہ کہتے کہتے لڑکا ہمیں کتنی دور کن کن راستوں پہ لے گیا۔ اب ہم قلعہ کے بالکل عقب میں تھے۔

"لڑکے کہاں ہے وہ درخت"۔

اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "وہ دکھائی دے رہا ہے جی"۔

"یار میرے۔ یہ درخت اتنا بڑا تو نظر نہیں آ رہا کہ اس میں چالیس چور سما جائیں"۔

"جی اس میں چالیس چور چھپ جاتے ہیں۔ اس کی کھکھل بہت چوڑی ہے"۔

مغنی صاحب اس روایت کی نہ تصدیق کرتے ہیں نہ تردید۔

"اچھا دیکھ لیا درخت۔ لو یہ پیسے، یہاں سے کسی بس میں بیٹھ کر اپنے ٹھکانے پر چلے جاؤ"۔

لڑکے نے معاوضہ وصول کرنے کا جواز پیدا کر لیا تھا۔ اب وہ اطمینان کے ساتھ ہم سے پیسے وصول کر سکتا تھا۔

اور لیجیے یہ قطب شاہیوں کے مزار ہیں

دشت کے چھوٹے مقبروں پہ نہ جا
روضے سب گلستان ہوتے ہیں

ہر مقبرہ اپنی جگہ ایک گلستان ہے۔ خاص طور پر قلی قطب شاہ کا مقبرہ۔ مغنی صاحب مقبرے دکھاتے جاتے ہیں۔ ان کے تعمیری اوصاف گناتے جاتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ قطب شاہی سلسلہ کے سب سلاطین یہاں دفن ہیں سوائے ابوالحسن تانا شاہ کے جسے شہنشاہ اورنگزیب یہاں سے گرفتار کرکے لے گیا تھا۔ اور مغنی صاحب تانا شاہ کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں — کیا آن بان تھی اس کی۔ مزاج میں کیسی نفاست تھی اور کیا رکھ رکھاؤ تھا۔ اس وقت وہ دستر خوان پہ بیٹھا تھا جب اطلاع ملی کہ دغابازی سے قلعہ کا دروازہ کھل گیا۔ اورنگ زیب کی فوجیں قلعہ کے اندر آ گئی ہیں۔ کہا، آنے دو۔ اسی اطمینان کے ساتھ ما حضر تناول کرتا رہا۔ جب اورنگ زیب داخل ہوا تو اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔

"پھر کیا ہوا"۔

"بس پھر سلطان کو قید کرکے یہاں سے لے گئے۔ رستے میں اسے پیاس لگی۔ ایک پنہارن نے اسے پانی پلایا۔ سلطان نے ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے اتار کر اسے دی کہ نیک بخت اس وقت ہمارے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ بس یہی ہے"۔

واپسی پر ایک دوست نے پوچھا۔ "انتظار صاحب! آپ نے کسی مقبرے کے سائے میں ایک چھوٹی سی مسجد دیکھی ہوگی"۔

"ایک مسجد نہیں۔ مختلف مقبروں کے متصل مختلف مسجدیں نظر آ رہی تھیں"۔

"وہ تو خیر ہر مقبرے سے متصل ایک مسجد آپ نے دیکھی ہوگی۔ مگر ایک مسجد عجب سی نظر آئی ہوگی۔ بالکل چھوٹی سی"۔

مجھے یاد آیا "ہاں ہاں ایک ننی مسجد تھی اور میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنے بلند مقبرے کے سائے میں اتنی ننھی سی مسجد"۔

"جی۔ وہ مسجد اورنگ زیب نے اپنے نماز پڑھنے کے لئے بنوائی تھی۔ آپ نے دیکھا کہ قطب شاہیوں کی تعمیرات کے مقابلہ میں یہ تعمیر کیا لگتی نظر آتی ہے۔ بس یہ ہے اس



شہر میں اورنگ زیب کا تعمیری کارنامہ"۔

میں نے محسوس کیا کہ اورنگ زیب کا جب بھی حوالہ آتا ہے اور یہ حوالہ بار بار آیا تو دوست اس کا ذکر بڑے طنزیہ لہجہ میں کرتے ہیں۔ شاید حیدرآباد کے مسلمان شہنشاہ اورنگ زیب کے پولیس ایکشن کو ابھی تک بھول نہیں سکے ہیں۔

سالار جنگ میوزیم بھی دیکھا۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ یہاں امرا و رؤسا اس طرح کے ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک شخص کے جمع کئے ہوئے نوادرات ہیں۔ کچھ باپ دادا کے، زیادہ اپنے کہ انہیں آراستہ کیا گیا تو ہندوستان کا ایک نمائندہ میوزیم وجود میں آیا۔ کاش پاکستان کے امرا و رؤسا پر بھی نواب سالار جنگ یا کسی ایسے ہی نواب کا پرچھاواں پڑ جاتا۔

بس کرو بھائی۔ بہت نہال ہو لئے۔ تم اس شہرِ طرب میں چار دن کے لئے آئے تھے چار دن کی چاندنی اب ہوا ہوا چاہتی ہے۔ یہ اس شہر میں تمہاری آخری شام ہے حیدرآباد کا آخری دیدار کرو۔ کرمفرماؤں سے ملو۔ ڈاکٹر رشید موسوی کا شکریہ ادا کرو کہ کیا مہمان نواز خاتون ہیں اور حمایت اللہ صاحب کا کہ کیا خوب میزبانی کی۔ انور معظم اور جیلانی بانو کے گھر چل کر کھانا کھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ہاں بیچ میں بنجارہ ہلز بھی تو آتی ہے۔ بنجارہ ہلز کی بلندیوں پر ایک اپنی طرز کا بنگلہ۔

"انتظار صاحب۔ یہ جو سامنے کارنس پر تصویر نظر آ رہی ہے"، مغنی تبسم مجھے بتاتے ہیں۔ "یہ علی یاور جنگ کی تصویر ہے۔ اصل میں طیبہ بیگم علی یاور جنگ کی بھانجی ہیں"۔

طیبہ بیگم لپک جھپک اندر گئی تھیں۔ اب جو واپس آئی ہیں تو ان کے ہمراہ ایک بزرگ خاتون ہیں۔ بالکل میدے کی لوئی۔ چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ داخل ہوتی ہیں۔ طیبہ بیگم میرا تعارف کراتی ہیں۔ کتنے شفیق انداز میں مسکراتی ہیں۔ واپس چلی جاتی ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں پھر واپس آتی ہیں۔ اب کے ان کے ہاتھ میں ایک بہت پرانی آٹوگراف بک ہے ایک صفحہ کھول کر میری طرف بڑھاتی ہیں۔ ایم اے جناح ۱۹۲۲ء یا اس کے آس پاس کا

کوئی سال (اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا) یہ تو بہت تاریخی آٹو گراف ہے۔ ورق الٹتا پلٹتا ہوں۔ برصغیر کی نامی گرامی شخصیتوں کے لکھے کلمات سامنے آتے چلے جاتے ہیں میں دیکھ کر بصد ادب واپس کرتا ہوں۔

وہ بزرگ خاتون ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ آٹو گراف بک پھر میری طرف بڑھا دیتی ہیں۔ میں سٹ پٹا کر انہیں دیکھتا ہوں۔

طیبہ بیگم اس خاموش اشارے کی وضاحت کرتی ہیں۔ "کہہ رہی ہیں کہ آپ اپنا آٹو گراف دیں"۔

"میں آٹو گراف دوں اس کاپی پر جس میں برصغیر کی اتنی نامی گرامی شخصیتیں اکٹھی ہیں"۔

ورق الٹتے پلٹتے ہوئے۔۔۔۔۔ "اور اس میں تو اب کوئی جگہ بھی باقی نہیں ہے"۔

پھر بھی میں ایک گوشہ ڈھونڈ نکالتا ہوں اور آٹو گراف دے کر سرخرو ہوتا ہوں۔

اب طیبہ بیگم ایک کتاب میری طرف بڑھاتی ہیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ میری کتاب ہے"۔

طیبہ بیگم کی کتاب "ابرِ نیساں"۔ خاکوں کا مجموعہ۔ نواب عماد الملک، ڈاکٹر خسدیو جنگ، نواب علی یاور جنگ۔ مگر خلیل الرحمٰن اعظمی نے دیباچہ میں یہ کیا لکھ دیا ہے:

"جب تک وہ ایوانِ شاہی سے نکل کر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں اور غریبوں کے جھونپڑوں میں ان چٹائیوں پر بیٹھ کر ان کے دکھ درد اور ان کے اندر چھپی ہوئی انسانیت و شرافت کو نہیں سمجھیں گی اس وقت تک ان کا مطالعہ نامکمل رہے گا۔ ہم اگلے مجموعۂ مضامین میں ایسی مٹی کی مورتوں کے منتظر ہیں"۔

یہ تو اچھی زبردستی ہے۔ لکھنے والے کے اپنے مشاہدے اپنے تجربے کے کوئی معنی نہ ہوئے۔ بس جو یارانِ طریقت کہہ دیں وہی اسے لکھنا چاہیئے۔ اے بی بی طیبہ بیگم!



ہدایتیں دینے والوں اور نصیحتیں کرنے والوں کے بھرے میں مت آجائیں جس لکھنے والے نے ان کے کہے پر کان دھرے وہ گیا۔ جو طبقہ تمہارے تجربے کا حصہ ہے جن کرداروں، جن شخصیتوں کو تم نے جانا پہچانا ہے جنہیں بیان کرنے کو تمہارا جی چاہتا ہے ان کے بارے میں لکھو۔

اب صبح کا وقت ہے۔ رخصت کا ہنگام ہے۔ وداع کرنے کے لئے دوست احباب آن موجود ہوئے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، حمایت اللہ صاحب، غیاث متین، سفر کا ٹٹو بندھا کھڑا ہے۔ ہوائی جہاز اڑنے کے لئے تیار ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے اس شہر میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ مکہ مسجد جاکر کالے پتھر کی چوکی پر بیٹھ گیا تھا اور روایت دوستوں نے یوں بیان کی کہ جو مہمان اس پتھر پر بیٹھتا ہے وہ دوبارہ حیدر آباد آتا ہے۔ تو اگر مکہ مسجد کے کالے پتھر میں زور اور اثر ہے تو میں کل ہی اور کل نہیں تو پرسوں کچے دھاگے میں بندھا چلا آؤں گا۔

لیجئے۔ ہر پھر کر پھر دلی میں۔ مگر بس آج کے آج۔ کل صبح ہی جے پور دوڑ جانا ہے شریکِ حیات شریکِ سفر۔ منی بس میں بیٹھا گلابی شہر کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہوں میں سمجھتا تھا کہ دلی سے نکلتے ہی زمین و آسمان بدل جائیں گے لیکن کتنا رستہ طے کر لیا اور وہی جغرافیہ چلے جا رہا ہے۔ وہی زمین کی رنگت وہی آسمان کی کیفیت۔ آخر راجستھان اپنے درشن کیوں نہیں دیتا۔ اک ذرا صبر۔ دے گا۔ یہ جو برابر میں ایک بیل گاڑی دوڑ رہی ہے اس پہ ایک نظر ڈال لو۔ خوب، کیا لمبے لمبے گھونگھٹ ہیں۔ کوئی گھونگھٹ گلابی، کوئی بسنتی کوئی لال بھبھوکا۔ اور ہر گھونگھٹ میں گوٹا ٹنکا ہوا۔ گھونگھٹ والیوں میں کوئی لڑکی بالی ہے، کوئی پکی عمر والی ہے، کوئی بوڑھیا۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت مگر گھونگھٹ اتنا ہی لمبا اتنا ہی رنگین اور گوٹا ٹھپا بھی اتنا ہی۔ ایک گاڑی، پھر دوسری گاڑی، پھر تیسری گاڑی۔ لال پیلے گھونگھٹ قطار اندر قطار۔ تو گویا راجستھان نے اپنے درشن دینے شروع کر دیے اور اب زمین کی شکل بھی بدلتی جا رہی ہے کہ جے پور قریب ہے۔ جے پور کو آنے دو۔ سب کچھ بدلا ہوا نظر آئے گا۔

سب کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ تو شہر ہی اور طرح کا ہے۔ سجا بنا، ترشا ترشایا، یہاں سے وہاں تک گلابی ہی گلابی۔ سڑکیں تو بالکل قینچی سے تراش کر بچھا دی ہیں۔

مجال ہے کہ کہیں ٹیڑھ میڑھ آجائے۔ ایک سڑک کے متوازی دوسری سڑک۔ دوسری کے متوازی تیسری سڑک۔ اور یہ سڑک سڑک مورتیاں کیسی دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ سوریہ دیوتا کی مورتیاں ہیں۔ جس کھمبے، جس ستون پہ نظر ڈالو اس پہ سوریہ دیوتا اپنی کرنیں بکھیرتے دکھائی دیں گے۔ چوپڑ سے گزرے۔ بازار میں آئے۔ یہ سامنے ہوا محل نظر آرہا ہے۔ گلابی جھروکوں سے آراستہ۔ جھروکے، جالیاں۔ باقی کچھ نہیں۔ بس ساری عمارت انہیں جھروکوں جالیوں سے عبارت ہے مگر آخر کیوں۔ ہاں اب یہاں سے کوئی نہیں جھانکتا۔ مگر گزرے سمے میں جب راجپوت سورما نقارۂ جنگ پہ چوب پڑنے کے ساتھ اس راہ سے اپنی راجپوتی آن بان سے گزرتے تھے تو رانیاں، راجکماریاں ان جھروکوں جالیوں سے ان کے درشن کرتی تھیں۔ اب نہ وہ راجپوت سورما نظر آتے ہیں نہ رانیاں راجکماریاں۔ گھونگھٹ والیاں جابجا نظر آتی ہیں مگر ان میں کوئی راجکماری نہیں پھر بھی یہ راہیں شاد آباد نظر آتی ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے مگر آدمی پہ آدمی نہیں گرتا۔ سب اپنی اپنی راہ چلے جا رہے ہیں۔ ہزاری بزاری۔ بنئے بقال جوہری بزاز سب اپنی اپنی بیٹھک پہ بیٹھے ہوئے۔ دکانیں مال و اسباب سے بھری ہوئیں۔ جے پوری رنگوں میں رچی ہوئیں۔ جے پور کا رنگوں کا اپنا مذاق ہے۔ یوں شوخ بھڑکیلے رنگ آپ کی طبیعت قبول نہ کرے مگر جے پور کے صناع ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں کہ طبیعت ان پر لہلوٹ ہو جاتی ہے۔

اب دن ڈھلنے لگا ہے۔ اپنے ٹھکانے پہ چلو۔ نہاؤ دھوؤ اور جلسہ میں چلنے کی تیاری کرو۔ ہم مہمان ہیں اور راجستھان اردو اکیڈیمی کے جس کے سیکرٹری ہیں سید امین الدین احمد اور صدر ہیں راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر محمد علی زیدی۔ باتوں باتوں میں ان سے ہماری عزیزداری بھی نکل آتی ہے۔ پتہ چلا کہ یہ تو ہمارے کرار صاحب کے بھتیجے داماد ہیں۔ تو راجستھان اکیڈیمی نے ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا ہے۔ یوں تو



ہمیں مختلف شہروں میں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا موقع ملا ہے مگر جے پور کا ریسٹ ہاؤس بالکل دلہن نظر آتا ہے۔ کیا سجا بنا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سامنے چھت پر مور مورنیوں کی سبھا جمی ہے۔ اب ذرا دھوپ ڈھلی ہے تو ایک مور منڈیر پہ نمودار ہوتا ہے پھر چھت پہ اتر آتا ہے۔ اپنی لمبی دم کے ساتھ خوش خرامی میں مگن ہے کہ ایک مورنی کہیں سے نمودار ہوتی ہے اور خوش خرامی میں سنگت کرتی ہے۔ پھر دوسری مورنی کہیں سے نکل آتی ہے۔ پھر تیسری مورنی۔ پھر چوتھی مورنی۔ ایک مور اتنی مورنیاں۔ مور اچھا خاصا راجہ اندر بن جاتا ہے اور اب جبکہ میں نے مور مورنیوں کی یہ اندر سبھا دیکھ لی ہے تو مجھے اعتبار آیا ہے کہ میں واقعی جے پور میں ہوں۔

جھٹ پٹے میں دونوں وقت ملے اور جدا ہو گئے۔ بس اسی کے ساتھ مور مورنیاں رخصت ہو گئے۔ اب کہیں قریب ہی سے مور کی درد بھری پکار سنائی دے رہی ہے شام کا سمے عجب سمے ہے۔ مور کو رجھاتا بھی ہے ڈراتا بھی ہے۔ شام کے آغاز کے ساتھ مور کتنا خوش نظر آتا ہے مگر جب اندھیرا پھیلتا ہے تو عجب ہراس کے ساتھ پکارتا ہے۔

مور کی درد بھری آواز آنی بند ہو گئی ہے۔ شاید اسے صبر آ گیا ہے اور اب مجھے چلنا چاہئے کہ تقریب کا وقت آن پہنچا ہے۔ اکیڈیمی نے ایک شبِ افسانہ کا اہتمام کیا ہے۔ محمد علی زیدی صاحب نے مقالہ پڑھا جس میں میرے ایک افسانے "کشتی" کا انہوں نے تجزیہ کیا۔ میں نے یہ افسانہ پڑھ کر سنایا۔ لیجئے شبِ افسانہ ہو گئی۔

صبح ہوئی اور ہم شہر کی سیر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ زیدی صاحب کے صاحبزادے حیدر میاں ہمارے گائڈ بنے۔ ٹورسٹ بس میں بیٹھنے پہ جو گائڈ میسر آیا وہ ان پہ مستزاد۔ اہم مقامات پہ بس رکتی ہے۔ گائڈ بتاتا ہے، ہم سنتے ہیں اور آگے چل پڑتے ہیں۔ جنتر منتر دیکھو۔ راجہ کا محل دیکھو۔ محل کی خوب چمک دمک ہے۔ کسی گوشے سے تنہائی

کی آواز آ رہی ہے جس سے پورا محل گونج رہا ہے۔ لیکن سچی بات ہے میں اس محل سے کچھ ایسا متاثر نہیں ہوا۔ اس کی ایک خرابی تو یہ ہے کہ یہ بہت نیا نظر آتا ہے۔ ارد گرد کوئی کہنہ کائی آلود ضخیم فصیل نہیں ہے۔ اندر جاؤ تو سب کچھ سلامت نظر آتا ہے۔ چھتیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ زمانے نے اسے بالکل برباد نہیں کیا ہے۔ پھر چلتے چلتے یکایک ایک حال آ جاتی ہے۔ اس سے آگے برآمدے ہیں قالین بچھا ہوا، صوفے سجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور صاحب کا چپڑاسی کھڑا نظر آتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ یہاں محل کے اس گوشے میں مہاراجہ کے کوئی بیٹے پوتے رہائش رکھتے ہیں۔ مہاراجہ کا کوئی نکھٹو بیٹا پوتا اپنی زوال پسندی میں مگن زمانے سے بےخبر یہاں براجمان ہوتا تو بھی ایک بات تھی مگر یہ صاحب تو کوئی جرنیل کرنیل ہیں۔

ایک تو یہ محل بیچ آبادی میں ہے۔ پھر اس کے اندر رہائش بھی ہے۔ محل مجھ پر خاک اپنا تاثر چھوڑتا۔ میں تو لال قلعہ تک سے اس کے باوصف کہ اسے ہند اسلامی تہذیب کی ایک اہم نشانی جانتا ہوں، اس وجہ سے بدکتا ہوں کہ بیچ آبادی میں ہے اور اس کے اندر قسم قسم کے دفتر کھلے ہوئے ہیں، بازار لگے ہوئے ہیں۔ لال قلعہ کا زمانہ رخصت ہو گیا مگر زمانے نے اسے یہ سہولت نہیں دی کہ وہ نئے زمانے سے بےتعلق نئی خلقت سے دور اپنے اجاڑپن میں سانس لے سکے۔

بہت تو نہیں مگر تھوڑا بہت قدامت کا احساس مجھے قلعہ میں جا کر ہوا جو شہر سے باہر کسی قدر فاصلہ پہ ایک پہاڑی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی فصیل ہی کہہ رہی ہے کہ یہ واقعی کوئی قلعہ ہے۔ مگر محلات اور مندر تو بلندیوں پر واقع ہیں۔ وہاں تک پہنچنے کیلئے تو بہت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔ ایک متبادل صورت بھی تھی۔ گائڈ نے مطلع کیا کہ جو لوگ چڑھائی کے کشٹ سے بچنا چاہتے ہیں اور ہاتھی کی سواری کا شوق رکھتے ہیں وہ ہاتھی والوں سے بات کریں۔ ہاتھی انہیں محلات تک لے جائیں گے۔ میں نے عالیہ سے صاف کہہ دیا



کہ ہم ہاتھی پر نہیں چڑھیں گے۔

"کیوں نہیں چڑھیں گے"۔

"بس نہیں چڑھیں گے"۔

میں نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ پیسے دے کر ٹکٹ لے کر بس میں سوار ہوا جا سکتا ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھا جا سکتا ہے، ہاتھی پر نہیں۔ اس میں ہاتھی کی بھی سبکی ہے اور اپنی بھی بےعزتی ہے اور جب ہم چڑھائی چڑھ کر اس بڑے دروازے پر پہنچے جسے جے پول کہتے ہیں تو عجب عبرت فزا منظر نظر آیا۔ کیا دیکھا کہ ہاتھیوں والے راستے سے ایک ہاتھی چلا آ رہا ہے۔ ہودے میں ایرا غیرا نتھو خیرا سوار ہیں۔ پیچھے پیچھے ایک نفیری والا نفیری بجاتا چل رہا ہے۔ ایک ہاتھی، پھر دوسرا ہاتھی، پھر تیسرا ہاتھی۔ ہر ہاتھی پر ایرا غیرا نتھو خیرا سوار۔ ہر سواری کے پیچھے ایک نفیری والا نفیری بجاتا ہوا۔ جے پور کے ہاتھیوں کے ساتھ یہ کتنا سنگین مذاق ہے۔

میں نے ہندوستان کے پچھلے سفر میں اور اس سفر میں جب جب جہاں جہاں ہاتھی کو دیکھا ایک مضحکہ خیز عبرت انگیز صورت حال میں دیکھا۔ اس کا حال دیکھ کر میں ہنسا بھی ہوں اور رونا بھی آتا ہے . . . . میں اس قسم کے اشارے پہلے کر چکا ہوں۔ میرے خیال میں اب مجھے ہاتھی کے بارے میں کھل کر اپنا موقف بیان کر دینا چاہیے۔ ہاتھی ہمارے نئے زمانے کی سواری نہیں ہے۔ نہ یہ جمہوری عہد کی سواری ہے نہ آمریت سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔ یہ بادشاہوں راجوں مہاراجوں رؤسا و امرا کی سواری تھی۔ ان کے شاہانہ وقار، ان کے ٹھسیانہ ٹھاٹ باٹ کی امین۔ وہ دور گزر گیا۔ اچھا ہوتا کہ اس دور کے گزرنے کے ساتھ ہاتھی جنگلوں میں واپس چلے جاتے۔ صحیح ہے کہ ہاتھی ان خاص جانوروں میں سے ہے جن سے ہندوستان پہچانا جاتا ہے۔ مگر وہ تو قدیم ہندوستان تھا جو ہاتھی کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا نئے جمہوری ہندوستان میں ہاتھی ایک اَنمل ہے۔ اور میں یاد کرتا ہوں بہادر شاہ ظفر کے مولا بخش ہاتھی کو۔ کتنا صاحبِ نظر اور صاحبِ غیرت تھا وہ ہاتھی جس نے بہادر شاہ ظفر کے

زوال کے ساتھ جان لیا کہ بادشاہت کا زمانہ ختم ہوا اور اس زمانے کے ساتھ اس کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ اب زندہ رہو گے تو برطانوی افسر شاہی اور ان کے کالے ماتحتوں کے ساتھ گزارہ کرنا پڑے گا اور اس میں خواری ہی خواری ہے۔ بس یہ سوچ کر اس نے کھانا پینا بند کر دیا۔ اور لمبے تھیوں والے وقار کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

۱۸۵۷ء میں بادشاہ کے ہاتھی نے بادشاہ سے بڑھ کر اپنی آن اور اپنی غیرت کو قائم رکھا اور دنیا سے گزر گیا۔ پتہ نہیں اور کتنے ہاتھی تھے جو اس رستاخیز میں میدانِ جنگ میں کھیت ہوئے یا بھوکے پیاسے رہ کر دنیا سے گزر گئے یا جنگلوں میں نکل گئے مگر بہت سے ہاتھیوں نے ریاستوں کے بے اختیار راجاؤں اور نوابوں کے ساتھ گزارہ کرنے کی ٹھان لی یوں انہوں نے نشستم بشستم ایک زمانہ گزارا یہاں تک کہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔

آزاد ہندوستان نے جمہوری نظام کو اپنایا اور ریاستوں کو اپنے اندر ضم کر لیا۔ ریاستیں کسی نہ کسی طور ہندوستان کی جمہوریت میں ضم ہو گئیں مگر جمہوری ہندوستان ہاتھیوں کو جو اپنی جگہ ایک ریاست تھے، ضم کرنے میں ناکام رہا۔ ہندوستان میں جہاں جہاں مجھے ہاتھی نظر آیا ہندوستان کی اس ناکامی کا مجھے شدت سے احساس ہوا۔ ہاتھی جمہوری جانور نہیں ہے۔ ایک شاہانہ مخلوق ہے۔ اس کا جثہ، اس کی چال ڈھال، اس کے طور اطوار سب شاہانہ روایت میں رچے بسے ہیں۔ نئے جمہوری ہندوستان میں وہ ایک اَنمل ہے۔ یوں میں جمہوریت کا حامی ہوں۔ نظاموں میں لے دے کے یہی ایک نظام ہے جس میں مجھے فکر و احساس کی آزادی کا کسی قدر امکان نظر آتا ہے مگر نئے ہندوستان میں ہاتھی کا زوال دیکھ کر مجھے جمہوریت کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے ہیں۔

لیجیے۔ ہاتھیوں کے چکر میں میں لنگوروں کو تو بھول ہی چلا تھا۔ ہاتھی پہ سوار نہ ہونے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ لنگوروں سے ملاقات ہو گئی۔ جس راہ پیدل اونچائی پہ چڑھتے ہیں اس راہ پہ آس پاس درختوں میں بیٹھے درختوں سے لٹکے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے



سفر میں لنگوروں سے میری پہلی ملاقات شہنشاہ اکبر کے مقبرے میں ہوئی تھی مگر دور سے۔ پھر جب میں پچھلی مرتبہ اجنتا گیا تھا تو راہ میں ان کی دید ہوئی تھی مگر وہ بھی دور دور سے دید ہوئی تھی۔ اب جے پور میں آ کر ملاقات بہت قریب سے ہوئی۔ اتنے قریب سے کہ ان سے ہاتھ ملایا جا سکتا تھا۔ مگر یہ لنگور اس وقت بالکل ہاتھ ملانے کے موڈ میں نہیں تھے دھوپ سخت تھی۔ ان کا حال بے حال نظر آ رہا تھا۔ ایک لنگورنی کی گود میں بچہ کا یہ حال تھا کہ بالکل مردہ نظر آ رہا تھا۔ تھوڑا چھیڑنے پہ پتہ چلا کہ وہ مرا نہیں ہے گرمی نے اسے ادھ موا ضرور کر دیا ہے۔

لو بھئی ہم نے جے پور دیکھ لیا۔ ٹورسٹ بس نے ہمیں ریسٹ ہاؤس سے اٹھایا تھا دوپہر ہوتے ہوتے ریسٹ ہاؤس میں لا ڈالا۔ نہائے دھوئے۔ کھایا پیا۔ آرام کیا۔ بس اب واپس چلتے ہیں۔ باہر ٹورسٹ بس تیار کھڑی ہے۔ یہ ہمیں دلی تک لے جائے گی!

بس جے پور سے باہر نکل آئی ہے۔ دن ڈھلتا جا رہا ہے۔ آتے ہوئے دوپہر کی دھوپ میں یہ دائیں بائیں پیلی پہاڑیاں کتنی بے رنگ اور بے معنی نظر آ رہی تھیں۔ مگر اب ان میں معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ انھوں نے رنگ جو پکڑ لیا ہے ـــــ نیلا رنگ۔ مور اپنی لمبی نیلی دموں کے ساتھ ان بلندیوں پہ اتراتے پھر رہے ہیں۔ اچھا، اتنے مور آباد ہیں ان ٹیلوں پہ۔ آتے ہوئے تو ان کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ وہ دوپہر جو تھی۔ مور نے شاہانہ طبیعت پائی ہے۔ نازک مزاج ہے، آرام پسند ہے۔ دھوپ میں باہر نہیں آتا۔ صبح کو تھوڑی چہل قدمی کی۔ دوپہر کو آرام کیا۔ شام پڑے پھر باہر آئے۔ سیرِ چمن کی۔ اندھیرا ہوا اور پھر اپنے گوشے میں۔ شام کے اندھیرے پھیل رہے ہیں۔ مور نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اب کبھی دور سے کبھی قریب سے مور کی ڈری ہوئی پکار سنائی دے جاتی ہے۔

واپس پھر دلی میں۔ اور اے صاحبو! اب ہمارا سفر تمام ہونے لگا ہے۔ جن شہروں کی خاک چھاننی تھی چھان لی۔ مگر خاک ہی تو نہیں چھانی۔ بس شہر کو چھوا ہے اور واپس! کتنے شہروں کو چھوا۔ کتنے شہروں کو چھونے کی حسرت لے کر واپس جاؤں گا۔ شہروں کی بھی عجب لیلا ہے۔ ذرا چھو لو بس ایک قدم وہاں رکھ لو۔ لگتا ہے کہ شہر کے درشن ہو گئے۔ گھومو پھرو، گلیوں کی خاک چھانو، پھر بھی لگتا ہے کہ شہر نے نہیں درشن نہیں دیئے۔ شہر کیونکر مسافر پہ ظاہر ہوتے ہیں اور ظاہر ہو کر بھی کیسے اپنے آپکو چھپالے جاتے ہیں۔ عجب بھید بھاؤ ہے۔ مگر کون سے شہر، کہاں کے شہر۔ میں نے کتنے ملک دیکھے ہیں، ملکوں کو دیکھنے کی ایسی خواہش بھی نہیں۔ ایک دفعہ ترکی کا پھیرا لگایا تھا۔ انقرہ اور استنبول کو چھو کر چلا آیا تھا۔ نہ ان شہروں نے مجھے پکڑا، نہ میرے پاس انہیں پکڑنے کی خواہش نے زور مارا۔ تو کیا میرے لئے سارا جادو اس برِ صغیر کی بستیوں ہی میں ہے۔ اور دلی۔ دلی کی زمین پر تو بس قدم رکھتے ہی اندر کرنٹ دوڑ جاتا ہے۔ اسے لو اب خیال آ رہا ہے کہ دلی نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میں یہ سمجھتا رہا کہ دلی میں تو ہوں ہی۔ بس ذرا ان ڈھائی تین شہروں کو چھو آؤں۔ گیا اور آیا۔ بس اسی آنے جانے میں دلی مجھے چکمہ دے گئی۔ اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ واپسی کا وقت سر پہ آ گیا۔ دلی سے تو ملاقات ہوئی ہی نہیں۔ اس سے بہتر ملاقات تو پہلے ہو گئی تھی۔

کم از کم شمیم حنفی کی سنگت میں چند گلیوں میں تو چل پھر لئے تھے۔ اب کے یہاں آکر میں نے کیا خاک اڑائی۔ شروع کے چند دن دلی میں گزرے تھے سو وہ تقریبوں استقبالیوں اور دعوتوں کی نذر ہو گئے۔ جامع مسجد تم کتنی مرتبہ گئے۔ سیڑھیوں پہ تم کتنا بیٹھے۔ کوچہ چیلاں میں اہلے گہلے پھرے؟ بلیماراں میں جاکر جھانکا؟ محمود ہاشمی کے ساتھ جاکر چاندنی چوک کی تاریخی دکان کے سامنے کھڑے ہو کر جلیبیاں کھائیں؟ ریوتی کے ساتھ پراٹھے والی گلی میں جاکر بھوجن کیا؟ شمیم حنفی کے ساتھ جاکر آلھا اودل کے برگد کا دیدار کیا؟ اس عظیم برگد کے باسی بندروں سے ملے؟ جب یہ کچھ بھی تم نے نہیں کیا تو تم نے دلی میں آکر کیا خاک اڑائی۔ پھر دلی تمہیں درشن کیوں دیتی؟ دلی سے تم نے چھل کیا۔ تم سے دلی نے چھل کیا۔ اور اب؟ اب تو وقت ہی نہیں ہے۔ دو دن جانے میں رہ گئے ہیں دو دن میں تم کیا کر لوگے۔

یا میرے مولا۔ میں ان دو دنوں میں دلی سے کیسے نبٹوں گا۔ مجھے تو یہاں یاروں سے لمبی ملاقاتیں کرنی تھیں اور بیگم کا تقاضا ہے کہ خریداری کرنی ہے۔ بیگمات کے ساتھ سفر کرنے میں ایک قباحت یہ ہوتی ہے کہ خریداری مقدم بن جاتی ہے۔ جو باتیں مقدم ہوتی ہیں وہ ثانوی رہ جاتی ہیں۔ چلو خریداری میں کیا مضائقہ ہے۔ اس بہانے چاندنی چوک کی ایک مرتبہ اور سیر کر لیں گے۔ مگر چاندنی چوک جانے کے لئے وقت نہیں نکل رہا۔۔۔۔ بھاگ دوڑ۔ بھاگ دوڑ۔ اسی بھاگ دوڑ میں شمیم حنفی اور شاہد علی خاں سے مل ملا لئے۔ منیرا شہر میں ہے ہی نہیں۔ محمود ہاشمی مصروف ہیں۔ سخت مصروف۔ یہی تو ایک مصروفیت ہے جس کے کوئی معنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے مجھے زاہد ڈار اپنی بے مصرف زندگی کے ساتھ اپنے عہد کا سب سے بڑا مصروف آدمی نظر آتا ہے اور یہ کہ اس کی مصروفیت مجھے مصروف دوستوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بامعنی اور دقیع نظر آتی ہے۔

یہ دلی میں میری آخری شام ہے۔ ریوتی نے اچھا کیا کہ جن سے نہیں مل پایا تھا



انہیں گھر پہ بلا لیا۔ کوئی پنجابی کا لیکھک کوئی ہندی کا دانہ۔ کوئی وزیر کوئی سفیر۔ وزیر کے نام پی شو شنکر کہ ہندوستان کے وزیر توانائی ہیں اور اپنے سفارت خانہ پاکستان کے عسکری صاحب۔ لیجئے اجیت کور جی سے ان کی پنجابی کہانی بھی سن لی۔ رفیعہ حسن کے افسانے کی بھی بانگی دیکھ لی۔

اور لو صاحبو! صبحِ رخصت آن پہنچی۔ سب صبحیں نرم اور اجلی ہوتی ہیں۔ صبحِ رخصت زیادہ نرم زیادہ اجلی ہوتی ہے۔ اس میں دلوں کا گداز جو شامل ہو جاتا ہے۔ دلوں کا گداز دلوں کا اجلاپن۔ ڈمپل اور مونا نے جھپ جھپ ناشتہ تیار کر کے میز پر چن دیا ہے۔ مجھے جلدی ناشتہ کر لینا چاہئے۔ آخر ایئر پورٹ بھی تو پہنچنا ہے۔ کل تک میں اس گھر میں ایسے تھا جیسے اپنا ہی گھر ہے۔ یہیں رہتا سہتا ہوں۔ اب احساس ہوا ہے کہ میں تو اس گھر میں مہمان تھا۔ یہ گھر یہ چہرے میری نظروں سے اوجھل ہوا چاہتے ہیں۔ کل صبح جب میں لاہور میں اپنے گھر ناشتے کی میز پہ بیٹھوں گا تو ریوتی، بینو، منا، ڈمپل، مونا ——— یہ سب لوگ مجھ سے کتنی دور ہوں گے۔

اے لونا ذنگ صاحب آ گئے اور منورما بھابی۔ اب کے دلی کے زیادہ دن تو انہیں کے گھر گزرے ہیں۔ کتنا کشٹ کھینچا ہے انہوں نے اپنے ان دو غریب مہمانوں کیلئے اپنا آرام حرام۔ سارے جتن ہمارے آرام کے لئے۔ تو وہ اب ہمیں رخصت کرنے کے لئے آن پہنچے ہیں۔ تو اب رخصت کی گھڑی ہے۔

ایئر پورٹ پہنچتے پہنچتے شمس الحق عثمانی بھی آ گئے۔ اور ہاں عسکری صاحب بھی۔ انہیں دیکھ کر میری جان میں جان آگئی۔ کتابوں کا یہ انبار جو میں ہندوستان سے کمر پر لادے چلتا ہوں آسانی سے تو جہاز پر نہیں لد جائے گا۔ اس انبار کو دیکھتا ہوں اور پی آئی اے والوں کی نظروں کو دیکھتا ہوں۔ عسکری صاحب کے آ جانے سے کتنی ڈھارس ہو گئی ہے۔ کتنی کتابیں تو میں ریوتی کے حوالے کر آیا کہ تم نے میرے پیچھے بہت ہندی کی چندی کر لی۔ اب پھر سے

تھوڑی سی اردو پڑھ لو۔

سب مراحل طے ہو گئے۔ جہاز اڑنے کو ہے اور اب جب میں اپنی نشست پر آ کر بیٹھا ہوں تو سفر کے سارے شب و روز پیچھے پیچھے جہاز کے اندر آ گئے ہیں۔ بس جیسے انتظار کر رہے تھے کہ کب اپنی نشست پر آ کر بیٹھوں۔ کب وہ مجھ پر نرغہ کریں۔ میرے سفر کے چونتیس دنوں نے میرے گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ یہ دن مجھ سے کیا کہتے ہیں۔ شاید سفر کا جمع خرچ پوچھتے ہیں اور مجھے اپنا پچھلا سفر یاد آتا ہے۔ بالکل ایک خواب کی مانند۔ شروع سے آخر تک ایک سہانا خواب۔

ایک خوشگوار تجربہ۔ کسی تجربے کو دہرایا نہیں جا سکتا مگر نادان لوگ تجربے کو دہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بس دہرانے میں کوئی گرہ پڑ جاتی ہے۔ کوئی خرابی راہ پا جاتی ہے مگر میں سوچتا ہوں کہ سفر تو پھر اسی کو کہتے ہیں۔ سفر کو خواب نہیں ہونا چاہئے۔ تجربہ بننا چاہئے۔ میرے لئے سفر اب کے کس قسم کا تجربہ بنا۔ اچھا جہاز تو چل پڑا۔

جہاز بلند ہوتا جاتا ہے۔ دلی کے در و بام نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ علی گڑھ، لکھنؤ، پٹنہ، حیدر آباد، جے پور ایک ایک کر کے سب شہر میرا تعاقب کرتے ہیں۔ اور ہاپوڑ؟ میں پچھلے سفر میں ڈبائی جلتے جلتے پلٹ آیا۔ اچھا ہی کیا۔ ہاپوڑ بھی نہ جاتا تو اچھا کرتا۔ مگر مجھے تو اب کے سفر میں خراب ہی ہونا تھا۔ ساتھ میں دوستوں کو بھی خرابی سے دوچار کیا۔ اصل میں جس طور میں لاہور سے چلا تھا اور جہاز میں خراب ہوا تھا۔ اسی سے مجھے ایک وسوسہ سا تھا کہ کہیں کسی موڑ پر ضرور نیل کنٹھ نے میرا راستہ کاٹا ہے خیر کوئی بات نہیں۔ بے شک حرکت میں برکت ہے اور سفر میں راحت بھی ملتی ہے مگر مسافر رنجِ سفر بھی کھینچتے ہیں۔ میں اس سفر میں کیا کما کر چلا ہوں۔ بہت کچھ۔ اتنا کہ حساب کروں تو کر نہ سکوں۔ ساتھ میں تھوڑی اداسی بھی۔ ایک خلش بھی۔

جہاز بلند ہوتا جا رہا ہے



دلی کا دیار اب بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

اے ہاپوڑ کی اجاڑ گلیو! اب تم واپس جاؤ۔ اب کبھی خواب میں تم سے ملوں گا!

(۱۹۸۳ء)

# معذرت کا ڈیڑھ حرف

تو یہ ہیں میرے تین سفر۔ مارچ اپریل کے مہینوں میں پہلا حضرت نظام الدین اولیاؒ کے عرس کی تقریب سے ۸۷ء میں۔ دوسرا جامعہ ملیہ کے مختصر افسانہ سیمینار کی تقریب سے ۸۰ء میں۔ تیسرا جامعہ ملیہ کے میر سیمینار کی تقریب سے۔ مختصر افسانہ سیمینار اور میر سیمینار کی تقریب سے جو میں نے دو سفر کئے اور یہی سفر مفصل تھے تو ان کیلئے مجھے جامعہ ملیہ کا اور خاص طور پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ان سیمیناروں کے کرتا دھرتا وہی تھے اور انہیں کے بلاوے پر میں وہاں پہنچا تھا ورنہ میں کہاں سفر کہاں۔ بات یہ ہے کہ میرے تلوے میں کوئی تل نہیں ہے اور ہاتھ میں سفر کی لکیر بہت مدھم ہے۔ سو سفر کیلئے قدم اٹھتے ہی نہیں۔ مارا باندھی نکل کھڑا ہوتا ہوں تو بالعموم نیل کنٹھ رستہ کاٹ جاتا ہے۔ کتنی مرتبہ یوں ہوا ہے کہ جاتے جاتے واپس آیا اور بندھا بستر کھول دیا۔ ایک مرتبہ میں امریکہ کے سفر پہ چل کھڑا ہوا تھا۔ ظالم نیل کنٹھ نے رستہ اس وقت کاٹا جب میں کراچی پہنچ کر امریکہ کی سمت اڑنے کو تھا اور اگر پورے قافلہ کا سفر کھوٹا ہوا تو اس کی توجیہہ میں نے تو یہی کی کہ میں جو قافلہ میں شامل ہو گیا تھا۔ جب دوبارہ یہ قافلہ سفر پر چلا تو متعلقہ محکمہ نے عاقبت اندیشی سے کام لیا کہ جانیوالے صحافیوں کے زمرے سے میرا نام خارج کر دیا۔ سو مسٹر نکسن کے ساتھ بھی خیریت رہی اور سابق وزیراعظم بھٹو بھی ان سے ملاقات کر کے خیریت سے واپس آ گئے۔ اس قسم کے کسی اعلیٰ سطح کے سرکاری دورے میں بطورِ صحافی میرا

نام زندگی میں پہلی مرتبہ شامل ہوا تھا اور غالباً آخری مرتبہ بھی۔

میں الف لیلہ کا وہ مسافر ہوں کہ جب وہ جہاز میں سوار ہوا تو جہاز کہ چلنے پہ تیار تھا رُک کر کھڑا ہو گیا۔ کپتان نے کل پرزوں کو بہت دیکھا بھالا۔ حیران کہ جب کل پرزے درست ہیں تو چلتا کیوں نہیں۔ مسافر الگ پریشان کہ یہ کیا بدشگونی ہے کہ بادبان کھل گئے تھے، جہاز چلنے لگا تھا کہ رُک گیا۔ جہاز میں کوئی پہنچے ہوئے بزرگ بھی سوار تھے۔ انہوں نے اپنے علم سے جانا اور بتایا کہ فلاں مسافر کی نحوست سے جہاز چلنے سے رُکا ہے۔ کپتان نے اس سبز قدم مسافر کو جھٹ پٹ جہاز سے اتارا۔ اس کے اترتے ہی جہاز چل پڑا۔

الف لیلہ کے اس مسافر پہ جو بھی گزری سو گزری، اپنے متعلق میں اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ متذکرہ بالا سفر کے کھوٹا ہو جانے سے میری آرزوؤں کا کوئی خون نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ نئی دنیا کی سیر کرنے کا ارمان کبھی یہاں ہوا ہی نہیں۔ نئے زمانے کے جگمگ شہر بے شک وہ آج کے اصفہان نصف جہان ہوں مجھے اپنی طرف کھینچتے ہی نہیں۔ مجھے تو چھوٹے مقبروں، ٹوٹی حویلیوں والی پرانی بستیاں پکارتی رہتی ہیں۔ شوقِ سفر اپنے یہاں جتنا بھی ہے اس پکار کی حد تک ہے۔

اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ میرے یہاں شوقِ سفر کتنا محدود ہے۔ اندریں حالات میں سفر نامہ کے میدان میں کوئی معرکہ مارنے کا خیال دل میں کیسے لا سکتا ہوں۔ سو اس میدان کے طالع آزماؤں کو میری طرف سے کوئی اندیشہ دل میں نہیں لانا چاہئے۔ ہمیں آپ کو معلوم ہی ہے کہ بیرون ملک سفر کے راستے کھل جانے کے ساتھ سفر ناموں کی ہمارے یہاں آجکل کتنی ریل پیل ہے۔ لکھنے والے اس معصوم احساس کے ساتھ لکھ رہے ہیں کہ اردو میں سفر نامہ تو اب لکھا گیا ہے اس احساس میں مسرت کا کتنا سامان ہے۔ جب ایک نوخیز مَسیں بھیگنے کے ساتھ عشق کی وادی میں قدم رکھتا ہے تو کس معصومیت کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ اس وادی کا پہلا مسافر وہ ہے۔ اس طرح محسوس کرنے میں برائی بھی کیا ہے۔ ایک لذت، ایک احساس، ایک افتخار البتہ ہے



سر توڑ کوشش کی ہے کہ سفر نامہ کو بھی افسانہ اور ناول کی طرح ایک معتبر صنفِ ادب ثابت کر دکھایا جائے۔ اس کوشش میں بھی کیا مضائقہ ہے۔ آخر اس زمانے میں سب ہی پسماندہ گروہ حقوق کیلئے لڑ رہے ہیں اور سماج میں دوسروں کے برابر کا درجہ چاہتے ہیں۔ جو محنت کرے کمائے گا وہ سماج میں مقام بھی مانگے گا اور سفر نامہ میں اسوقت کمائی بہت ہے۔ سفر نامے اردو میں بیشک پہلے بھی لکھے گئے ہوں گے مگر اس زمین میں ابھی زیادہ ہل نہیں چلا ہے۔ بونے اور کاٹنے کی گنجائش بہت ہے مگر ایک مرتبہ پھر میں یاروں کو اطمینان دلا دوں کہ اس میدان میں میرے کوئی عزائم نہیں ہیں۔ عزائم ہوں گے کس بوتے پر۔ جس کے ہاتھ میں سفر کی لکیر مدھم ہو اس کے یہاں سفر نامہ کتنا پروان چڑھ سکتا ہے اور یہ جو ہندوستان کے سفر کے نام پر کچھ لکھا گیا ہے بس سمجھ لیجئے کہ : ؏

یہ بھی خیال سا اک خاطر میں آ گیا تھا

ویسے یہ کوئی اچھی بات تھوڑا ہی ہوئی۔ آدمی سفر کرے تو اس کی خوشبو کو تھوڑا سنبھالکر رکھے اگر وہ خوشبو لے کر آیا ہے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ؎

مکّہ گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

اور اس وقت ایسا زیادہ ہوتا ہے جب سفر کسی ایسے دیس کا درپیش ہو جس کے سلسلہ میں آپ کے کچھ ذہنی تحفظات ہوں۔ ایسی صورت میں مسافر کبھی کبھی بالکل ہی خالی ہاتھ واپس آتا ہے۔ اس باب میں یہ کم سفر یہ کہتا ہے کہ اے مسافرِ عزیز! اپنے سفر کو اپنے ذہنی تحفظات سے رائیگاں مت کر۔ حالتِ سفر میں دل کو کشادہ رکھ اور ذہن کے دریچوں کو کھلا چھوڑ دے۔ ہر بستی کی اپنی ہوا اور اپنی مہک ہوتی ہے۔ کوئی بستی بُرے آدمیوں سے مبرّا نہیں ہوتی۔ اور اچھے آدمیوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اور ہر سفر کے اپنے رنج ہوتے ہیں اور اپنی راحتیں۔ اس سب کیلئے اچھا ہو کہ مسافر اپنے آپکو کھلا رکھے۔ اسی سب کچھ سے کسی ترکیب اس سفر کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ اگر اس

خوشبو کو سنبھال کر رکھا جائے تو پھر وہ آدمی کے اندر بس جاتی ہے مگر اسے سنبھال کر رکھنے کیلئے بھی تو ظرف چاہیئے ۔ میں نے ہر مرتبہ کتنی کوشش کی کہ خوشبو کو اندر بسائے رکھوں۔ اچھا ہو کہ یہ خوشبو کسی اور سطح پر جا کر مہکے ۔ مگر ہر مرتبہ یہ ہوا کہ میں نے کسی تقاضے کو پورا کرنے کی غرض سے چار حرف لکھنے کیلئے قلم پکڑا اور بس۔ قلم چلا سو چلا۔ شوق نے بات بڑھائی اور رپورتاژ لکھا گیا۔

تو یہ سفرنامے اصل میں میری تنگ ظرفی کا مرقع ہیں۔ جن خوشبوؤں کو میں اندر بسا کر اور پکا کر کوئی نئی خوشبو کشید کرنا چاہتا تھا وہ میرے بے صبرے پن سے سب ہوا میں بکھر گئیں اور اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ اوڈیسی اور الف لیلہ کا عہد کیوں گزر گیا۔ خبر دینے اور واقعہ کو بیان کرنے کے لئے ہم اتنے بیتاب رہتے ہیں کہ تخیل کو بارآور ہونے اور بروئے کار آنے کا موقعہ ہی بیشتر نہیں آتا۔ ہمارے زمانے کی بے صبری ہمارے تخلیقی تجربے کو لے ڈوبی۔

مگر میرے پاس خبر دینے اور بیان کرنے کیلئے کیا ہے۔ یہ میری ناعاقبت اندیشی ہے کہ یہ بات میں اب سوچ رہا ہوں۔ یہ مجھے سفر سے پہلے ہی سوچ لینا چاہیئے تھا۔ چند سوال تو ایسے ہیں کہ ہندوستان کا سفر کرنے والے سے بہرحال پوچھے جاتے ہیں۔ کم از کم ایسے سوالوں کے جواب دینے کیلئے تو مجھے مسالہ جمع کر کے لانا چاہیئے تھا۔ مثلاً یہ کہ ہندوستان میں اردو کی کیا حالت ہے؟ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟ ہندوستان میں مہنگائی کتنی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میرے پاس ہونے چاہئیں تھے ۔ اگر میں ان سوالوں کے جواب فراہم کرنے سے قاصر ہوں تو یار یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ پھر تم ہندوستان کیا کرنے گئے تھے؟

اچھا ایک بات بتادوں۔ اردو کے متعلق کم از کم ایک شخصیت سے میں نے بہت سوال کیے تھے ۔ یہ شریف الحسن نقوی صاحب تھے جو دلی میں اردو کے لئے مختلف منصوبے چلا رہے ہیں۔ میں نے انہیں کرید کرید کر کچھ اعداد و شمار بھی جمع کر لئے تھے لیکن جب دوستوں کے سوالوں کا خاطر خواہ جواب دینے کی نیت سے میں نے اس کاغذ کو اپنے کاغذات میں ٹٹولا تو کاغذ ندارد۔ اب میں بالکل نہتا تھا اور دوست تھے کہ ہندوستان میں اردو کے احوال کے متعلق مجھ سے پوچھے جا رہے تھے



مجھے یاد آیا کہ ہندوستان میں بھی ایک اردو کے پرستار نے مجھ سے پوچھا تھا کہ پاکستان میں اردو کا کیا احوال ہے؟ میں نے یہ سوال ان دوستوں تک پہنچا دیا۔ بس اس پر وہ دوست چپ ہو گئے بات یہ ہے کہ اردو کے متعلق ہمارا تردّد تو ہندوستان کی حد تک ہے پاکستان میں آکر ہم اس فکر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں بلکہ بعضوں کا تو اس مقام پہ آکر زاویۂ فکر ہی بدل جاتا ہے ۔

بہرحال ہماری اپنی نفسیاتی ضرورتیں بھی تو ہیں۔ وقتاً فوقتاً ہمیں یہ اطلاع ملتی رہنی چاہیئے کہ مہنگائی ہندوستان میں بھی بہت ہے۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اطمینانِ قلب کی کوئی صورت تو ہمارے پاس ہونی چاہیئے۔ اور اگرچہ یہ بات مجھے عجیب سی نظر آتی ہے کہ اپنے یہاں کے سائن بورڈوں کی انگریزی تو ہمیں پریشان کرتی نہیں مگر دلّی کے ہندی سائن بورڈ جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں ہمیں بہت پریشان کرتے ہیں۔ تاہم میں دوستوں کی نفسیاتی ضرورتوں کو سمجھتا ہوں۔ ہندوستان میں اردو کی ابتری کی اطلاع کے بعد ہمیں یہ سوال زیادہ نہیں ستاتا کہ ہمارے دفتروں میں ابھی تک اردو کیوں نہیں جاری ہو سکی ہے؟

مطلب یہ ہے کہ میں ایسے سوالوں کی ضرورت کو سمجھتا ہوں۔ سفر کے بیچ کبھی کبھی خیال بھی آیا کہ کچھ قیمتی معلومات اکٹھی کر لینی چاہئیں، کچھ اعداد و شمار گرہ میں باندھ لینے چاہئیں۔ بچوں کیلئے کھلونے بیکر نہیں جا رہے ہو تو یہی کچھ لے چلو۔ مگر کچھ تساہل کچھ اعداد و شمار سے وحشت، بس میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ایک دفعہ ایک پرچہ پہ ایسی چند اجناس کے نرخ نوٹ بھی کر لئے تھے جو پاکستان کے مقابلہ میں وہاں مہنگی بک رہی تھیں۔ مگر یہ پرچہ بھی غتر بود ہو گیا۔ تو جو سوغات یاروں کو مطلوب تھی وہ میں نہیں لا سکا۔

آپ کہیں گے کہ پھر تم ہندوستان میں کیا خاک اڑانے کیلئے گئے تھے؟ سچ پوچھیے تو میں اسی نصب العین کے ساتھ گیا تھا کہ جو بستیاں اپنے لئے اب خواب و خیال ہو چکی ہیں وہاں جا کر نگر نگر اور ڈگر ڈگر خاک چھانیں گے، خاک پھانکیں گے۔ میرے تصور میں پرانے ہندوستان کی گرد آلود راہیں تھیں، بیل گاڑیاں تھیں، اِکے تھے۔ وہاں پالا پڑا ہوائی جہاز سے، ریل گاڑی

سے، موٹر کار سے، بس سے۔ اور پھر ہر منزل پہ آمد اور روانگی کے اندراج کا الجھیڑا۔ کیا زمانہ تھا کہ آدمی پہ سفر سوار ہوا اور وہ نکل کھڑا ہوا۔ نے غمِ دنیا نے غمِ کالا۔ نہ پاسپورٹ کا جھگڑا نہ ویزا کا جھمیلا۔ نہ آمد اور روانگی کے اندراج کا دم چھلّہ۔ اب یہ سب الجھیڑے ہیں۔ بندر کی دم سے بڑھ کر بندر کی دم!

۶ر نومبر ۸۲ء انتظار حسین